آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو غزل

ڈاکٹر سلیم زبیری

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

آزادی کے بعد

پنجاب میں اردو غزل

آزادی کے بعد

پنجاب میں اُردو غزل

ڈاکٹر سلیم زبیری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

AZADI KE BAAD PUNJAB MEIN URDUGHAZAL

Written by

Dr. Saleem Zubairy

Year of 1st Edition 2011
ISBN 978-81-8223- 843-5
Price Rs. 225/-

نام کتاب : آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو غزل
مصنف : ڈاکٹر سلیم زبیری
پتہ : H.No.104,Paththaran Wala
Bhumsi, Malerkotla-148023(Pb.)
Mobile:094639-16482
سن اشاعت اوّل : ۲۰۱۱ء
قیمت : ۲۲۵ روپے
ٹائپ اینڈ ڈیزائن : براڑ آرٹس
Ph:01675-264467,
Mobile:09256033695
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ
کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

انتساب۔۔۔

حقیقی اور تخلیقی

غزل نگاروں

کے نام

ترتیب

پیش لفظ	ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی	9
حرفِ آغاز	ڈاکٹر سلیم زبیری	13
تمہید		17
	☆ پنجاب کی ادبی خدمات	20
	☆ موضوع کی اہمیت	22
باب اوّل	غیر منقسم پنجاب کا ادبی ماحول	24
باب دوم	آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو غزل	46
باب سوم	اُردو غزل میں پنجابی کلچر	85
باب چہارم	اُردو غزل پر جدید ادبی رجحانات کے اثرات	89-173
	(الف) ترقی پسند تحریک	90
	(ب) حلقہ ارباب ذوق	117
	(ج) جدیدیت	125
	(د) مابعد جدیدیت	173
باب پنجم	روایتی غزل کا مثبت رجحان	192
باب ششم	نئی اُردو غزل عصری تناظر میں	209
باب ہفتم	پنجاب میں اُردو غزل کا مستقبل	232

پیش لفظ

ڈاکٹر سلیم زبیری نئی نسل کے اُن جواں سال قلم کاروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی محنتِ شاقہ، ذاتی کاوشوں اور دلچسپی سے اُردو دنیا اور خصوصاً مالیر کوٹلہ پنجاب کے ادبی منظر نامے میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے اور ادب کی مختلف جہتوں میں نئے امکانات تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم زبیری نے ابتدائی تعلیم پنجاب کے مختلف علاقوں میں حاصل کی میٹرک اور انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگری امتیازی حیثیت سے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ سے مکمل کی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے بی۔ایڈ کی سند حاصل کی بعد ازاں انھوں نے ''پنجاب میں اُردو غزل کے پچاس سال'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔اردو کے علاوہ وہ فارسی اور پنجابی زبان وادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجیز حکومتِ ہند کے ذیلی ادارے NRLC PATIALA میں بھی بحیثیت اردو لیکچرار انھوں نے کئی برس خدمات انجام دیں۔ان دنوں موصوف ریاست پنجاب کے شعبہء تعلیم میں بحیثیت اردو استاد وابستہ ہیں اور بحسن وخوبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم زبیری بیک وقت شاعر، افسانہ نگار اور ایک ممتاز ادیب ہیں۔ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین ہندوستان کے مختلف معیاری رسائل اور اخبارات میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔حال ہی میں ''تنقیدی زاویے'' کے عنوان سے ان کے تحقیقی وتنقیدی

مضامین کا مجموعہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں منعقدہ سیمیناروں اور اکیڈمک پروگراموں میں ان کی شرکت موصوف کی زبان و ادب سے گہری دلچسپی کا ثبوت ہے۔

سرزمینِ پنجاب کو ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے ہمیشہ امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس سرزمین ذہانت آفریں نے ایسی ایسی نادر و نایاب شخصیتوں کو جنم دیا ہے جن کے ذکر کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ نثر ہو یا شاعری، تحقیق ہو یا تنقید اُردو صحافت ہو یا ڈرامہ غرض کہ ادب کی ہر صنف میں پنجاب کو ہمیشہ سبقت حاصل رہی ہے۔ پنجاب کے زیادہ تر ادیب قصہ، پارینہ بن کر رہ گئے۔ مگر ان کی تخلیقات آج بھی زندہ ہیں۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

غیر منقسم پنجاب سے لے کر دورِ جدید تک بلا امتیاز مذہب و ملت شاعروں اور تخلیق کاروں کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ اس ادبی منظر نامے میں مالیرکوٹلہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہی مردم خیز خطہ ڈاکٹر سلیم زبیری کا مسکن ہے۔

"آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو غزل" ڈاکٹر سلیم زبیری کا تحقیقی مقالہ ہے جو بالترتیب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف آزادی سے قبل اُردو غزل کا بھرپور جائزہ پیش لیا گیا ہے بلکہ مستقبل اور اردو غزل میں پنجابی کلچر کا بطورِ خاص تجزیہ پیش کیا ہے۔

"اُردو غزل میں پنجابی کلچر" اس کتاب کا نہایت ہی اہم باب ہے۔ اردو شعر و ادب میں پنجابی کلچر کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے۔

"پنجابی لہجہ، آہنگ، تلفظ اور محاورہ شروع ہی سے اردو زبان کے

مزاج اور خون میں شامل رہا ہے۔ اردو کی روایت اور تاریخ میں
پنجاب اس طرح شامل رہا ہے جس طرح انسانی رگوں کے اندر
دوڑتے تازہ خون میں سرخ وسفید جسیمے"

سلیم زبیری نے غزل کو نئی تخلیقی حسیت کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ نیز نئے اور پرانے تخلیقی تصادم سے قطع نظر معاصر عہد کے تازہ کاررویوں کا غیر جذباتی تجزیہ معروضی انداز میں کیا ہے۔ غزل جیسی ریزہ خیال صنف میں اداسی کے ساتھ تنہائی کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ نئی غزل کی تخیلی فضا کی شناخت مانوس، فرحت ساماں اور محفوظ منظروں سے تعبیر ہے۔

اُردو غزل پر یہ الزام ہے کہ وہ عشق ومحبت، جام ومینا اور گل وبلبل کے دائرے تک محدود ہے لیکن جدید تقاضوں نے غزل میں نئے موضوعات کو جنم دیا اور اس کے دامن میں انواع واقسام بھر دیے اور ہر مقبول نظریہ، خیال اور شعری وتخلیقی تجزیہ اس کے دائرہ، فکر میں شامل ہو گیا۔ اور غزل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نئے تجربوں کو قبول کرنے اور انھیں اپنے دامن میں سمیٹنے کی قوت رکھتی ہے۔ غزل میں زبان کے تخلیقی اور جمالیاتی عناصر کا ایک سچا اور کھرا اظہار ملتا ہے۔

اس کتاب میں کم وبیش ڈھائی سو شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں بعض شعراء کے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو تشبیہاتی انداز سے معروف ہو کر خالص علامت کاری سے اپنی تکمیلیت کے ساتھ وقیع اور ارفع حقیقت کا ادراک کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم زبیری کی یہ فکر انگیز کاوش پنجاب کی شعری تاریخ کے ایک اہم باب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ موصوف نے نئے تخلیقی منظر نامے اور پنجاب کے شعر وادب کو مجموعی روایت کے تناظر میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس سے قبل پنجاب میں اردو غزل کے موضوع پر اس نوعیت کا کوئی ایسا مثبت مطالعہ نہیں کیا گیا تھا جس سے غزل کے ہمہ جہت پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہو۔

ڈاکٹر سلیم زبیری تجزیہ کاری کے فن سے واقف ہیں۔ انھوں نے بڑی دیدہ

ریزی اور سلیقے سے اس مقالے کی تکمیل کی ہے۔ '' آزادی کے بعد پنجاب میں اردو غزل '' کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ جو یقیناً پنجاب کی شعری تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو دنیا میں اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ڈاکٹر سلیم زبیری مستقبل میں اس سے بھی بہتر علمی کام کریں گے۔

ضیاء الرحمٰن صدیقی
ایسوسی ایٹ پروفیسر،
اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر
(حکومتِ ہند) سولن، ہماچل پردیش۔

۲رفروری ۲۰۱۱ء

حرفِ آغاز

آزادی کے بعد پنجاب میں ادبی تحقیق کے دوران نثر کی طرف تو توجہ دی گئی اور انفرادی طور پر مختلف ادبی شخصیتوں کی شخصیات اور خدمات پر تحقیقی کام تو ضرور ہوا لیکن بحیثیت مجموعی پنجاب میں اُردو کے شعری ادب پر کام ہونا باقی تھا اور بالخصوص غزل کے موضوع پر ایسا کام جس سے بطورِ خاص آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو غزل کے ارتقاء اور نئی غزل کے رجحانات کی مکمل طور پر عکاسی ہو تشنۂ تحقیق تھا۔ غزل کے موضوع پر کتابوں کی کمی نہیں لیکن پنجاب کے حوالے سے راقم سے پہلے اُردو غزل پر کوئی مبسوط تحقیقی کام کسی ذاتی ادارے اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کے کسی شعبے کی طرف سے ہو سکا۔ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالے اس موضوع کی اہمیت پر روشنی تو ڈالتے ہیں لیکن اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ غزل کے اس تحقیقی کام کی اہمیت اور ضرورت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

میں اپنے کرم فرما پروفیسر ڈاکٹر زینت اللہ جاویدؔ صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے تحقیق ایسے جاں گسل کام میں قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ خاص طور پر شکر گذار ہوں ڈاکٹر منظور حسن صاحب، پروفیسر نذیر حسن صاحب اور مشتاق وارثی صاحب کا جن کی تحریک اس موضوع پر کام کرنے کا محرک بنی۔ ممنون ہوں جناب پریم کمار نظر اور طارق کفایت صاحب کا کہ ان کرم فرماؤں نے تحقیق کے موضوع سے متعلق ذاتی لائبریری سے وافر تعداد میں شعری مجموعے عنایت فرمائے۔ احسان مند ہوں مرحوم اُستاد خالد کفایت صاحب کا، جناب ناشر نقوی، جناب رمضان سعید، ڈاکٹر اسلم

حبیب، پروفیسر محمود عالم، پروفیسر محمد اقبال، جناب سیّد کوثر علی شاہد جعفری، جناب پروین کمار اشک، ڈاکٹر محمد جمیل، ڈاکٹر سلطان انجم، ڈاکٹر روبینہ شبنم، ڈاکٹر ایوب خاں اور ناز بھارتی صاحب کا جن کا تعاون اور مفید مشورے شاملِ تحقیق رہے۔

حق تلفی ہوگی اگر میں شکریہ ادا نہ کروں جناب عبدالغفور صاحب (لائبریرین نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ، مالیرکوٹلہ) کا، اختر علی اختر (ریٹائرڈ لائبریرین نواب شیر محمد خاں میونسپل لائبریری، مالیرکوٹلہ) شری رام جیتا جی (لائبریرین، این۔آر۔ایل۔سی۔پٹیالہ)، جناب اشرف محمود نندن (بھاشا وبھاگ، پنجاب) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے لائبریرین حضرات کا جنھوں نے کتابوں کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

سپاس گزار ہوں اپنے خسر صابر علی زبیری صاحب کا۔ ہم کار برادر ایم۔انوار انجم اور کرم فرما پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی صاحب کا جن کی ترغیب و محبت اس کتاب کی اشاعت کا موجب بنی۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں اپنے دوست محمد شبیر اور سالک جمیل براڑ کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے کتاب کی کمپوزنگ کو خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

میں اُن تمام اساتذہ اور ادب نواز دوستوں کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے تحقیق کے سلسلے میں اپنا ہر ممکن تعاون دیا اور گاہے بگاہے اپنی قیمتی مشوروں سے نوازا۔

ڈاکٹر سلیم زبیری

آزادی کے بعد
پنجاب میں اُردو غزل

تمہید

غزل اُردو شاعری کی مقبول اور محبوب ترین صنفِ سخن ہے۔ ناقدین ادب نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ تنقیدِ غزل کے تعلق سے اُردو غزل کے نقادوں کے ہاں مثبت اور منفی دونوں طرح کے رویے پائے جاتے ہیں۔ اُردو کے پہلے نقاد حالی نے غزل کو ''مخربِ الاخلاق اور سوختنی'' قرار دیا اور کلیم الدین احمد نے اس کے سر ''نیم وحشی صنفِ سخن'' کا الزام رکھا۔ رشید احمد صدیقی نے اُردو غزل کا دفاع کرتے ہوئے اسے ''اُردو شاعری کی آبرو'' کہا۔ فراق گورکھپوری نے اسے ''انتہاؤں کا سلسلہ'' (Series of Climax) قرار دیا ہے۔ اختر انصاری نے اسے ''بلبلِ ہزار داستاں'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ عظمت اللہ خاں نے غزل پر سخت تنقید کرتے ہوئے بے تکلفی سے اُردو غزل کی گردن اُڑا دینے کا مشورہ تک دے ڈالا وہیں آل احمد سرور نے اُردو غزل سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''غزل میں لفظ کو کائنات بنانے کا عمل ملتا ہے اس کے علاوہ عندلیب شادانی اور جوش ملیح آبادی نے بھی غزل کی مخالفت کی ہے۔ غزل پر تقریباً ہر زمانے میں اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔

ولی دکنی سے غالب تک اور غالب سے عہدِ حاضر تک اس صنف نے ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ غزل ہر عہد میں بحث کا موضوع رہی ہے۔ جتنی تنقید اس صنفِ سخن پر کی گئی ہے شاید ہی کسی دوسری صنف پر کی گئی ہو۔ غزل اس قدر سخت جان ہے کہ باوجود اپنی نازک مزاجی کے اس نے ہر دور میں تنقید کے نشتر کھا کے اپنے آپ کو زندہ رکھا۔ غزل کی سرشت اور ہیئت و ترکیب پر تبصرہ کرتے ہوئے غزل کو ایک جاندار صنفِ سخن قرار دیتے ہوئے یوسف حسین خان رقمطراز ہیں:

''گزشتہ دو سو برسوں میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت اور جگر

کے موجودہ دور تک اُردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ صنفِ سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے۔"[1]

غزل زندہ دلانِ ادب کی جان اور ایمان ہے۔ تاریخ اُردو ادب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اکیسویں صدی تک پہنچنے کے لیے موضوعاتی اعتبار سے غزل نے ایک طویل سفر طے کیا ہے جو بدستور جاری ہے۔ شروع شروع میں اُردو غزل غمِ جاناں اور حدیث دلبراں تک ہی محدود تھی۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، حسن و عشق اور ساقی و مے خانہ اس کے خاص موضوع تھے۔ اسی لیے غالب کو کہنا پڑا تھا۔

ع "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے"

آج کی اُردو غزل نے زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا اور حالات کو بدلنا سیکھ لیا ہے۔ اب اس میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ دنیا کے تمام موضوعات و مسائل اس میں سما سکتے ہیں۔ اب اُردو غزل کی تنگ دامانی کا گلہ کرنا بے معنی ہوگا۔ اُردو غزل کو غزل بنانے میں اس کو عوام سے جوڑنے اور مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچانے میں اُردو شاعروں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں غیر اُردو داں حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد اُردو داں اور اُردو غزل کی شیدائی ہے۔

غزل ایک تہذیب کا نام ہے۔ جس کا برصغیر ہند و پاک اور بالخصوص ہمارے ہندوستانی سماج سے گہرا تعلق ہے۔ ہماری تہذیب کی جڑیں غزل میں اور غزل ہماری تہذیب کی جڑوں سے مربوط ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے سمجھنا کارِ لاحاصل ہوگا۔ اُردو غزل صدیوں سے لاکھوں دلوں پر راج کرتی آئی ہے اور آج بھی پوری دنیا میں کروڑوں لوگ اس کے چاہنے والے ہیں۔ اسے ہر دل عزیز بنانے میں اُردو کے معتبر

شاعروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ غزل عہدِ طفلی میں تھی تو میر نے اُسے چلنا سکھایا، غالب نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ داغ نے اسے جینے کا سلیقہ سکھایا۔ میر درد نے اسے تصوف کے مسائل بتائے، مومن نے اسے اپنی محبوبہ کا درجہ دیا۔ حسرت نے اس کی زلفوں کے پیچ وخم سنوارے اور آج غزل کا نکھرا ہوا روپ ہمارے سامنے ہے۔ شاعری کا ذکر چھڑتے ہی اُردو غزل ہمارے ذہن کے دروازوں پر دستک دینے لگتی ہے اور اس کا نام کانوں میں رس گھولنے لگتا ہے۔ یہ صنف ہندوستانی مزاج کے عین مطابق ہے یہ اُردو غزل ہی کا جادو ہے جو ایوانوں میں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ میدانِ سیاست کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر رچا ہے وہ ہمارے ملک کے وزیر دفاع ہوں یا وزیر خزانہ یا کوئی اور لیڈر اُردو سے ناآشنا ہونے کے باوجود اپنی تقریر کا اختتام اکثر اُردو غزل کے شعروں پر ہی کرتے ہیں۔ یہ اُردو غزل ہی ہے جو عوام کو عوام سے جوڑنے' قومی یکجہتی پیدا کرنے، حُب الوطنی کے جذبات اُبھارنے، اخلاقیات کا درس دینے، کردار سازی کرنے، انسانی اقدار کو سمجھنے، حالات سے باخبر رہنے اور سیاست پر کڑی نظر رکھنے کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ پیار اور محبت اور بھائی چارے کا پیغام بھی دیتی ہے۔ آج عالمی سطح پر انڈو پاک تعلقات کے لیے جو خوش گوار فضا قائم ہوتی نظر آ رہی ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک اُردو غزل کا بھی حصہ ہے غزل زخموں پر مرہم لگانے اور دلوں کو جوڑنے کا کام بھی کرتی ہے اور عالمی امن قائم کرنے کا پیغام بھی دیتی ہے۔ بقول جگر

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

پنجاب کی ادبی خدمات

خطہ پنجاب شروع ہی سے شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے یہی وہ سرزمین ہے جہاں آزادی سے پہلے اردو کے بڑے بڑے مراکز اور انجمنیں قائم تھیں۔ لاہور کو اردو کے مرکز کے نام سے جانا جاتا تھا۔ انجمنِ پنجاب لاہور کی بنیاد اسی سرزمین پر رکھی گئی۔ حافظ محمود شیرانی نے اردو زبان کا تعلق اسی زمین سے جوڑا ہے۔ پنجاب ایک زرخیز اور مردم خیز علاقہ ہے اس علاقے نے بڑی نامور اور قد آور شخصیتیں اردو ادب کو دی ہیں۔ تقسیم وطن سے پہلے جن ادیبوں اور شاعروں نے اردو ادب کے دامن کو اپنے جواہر پاروں سے مالا مال کیا ان میں حالی، آزاد، اقبال، فیض، حفیظ جالندھری، کرشن چندر، بیدی، سعادت حسن منٹو اور تلوک چند محروم کافی مشہور ہیں۔

آزادی کے بعد جن شاعروں نے اردو غزل کی آبیاری کی، اردو غزل کو سنبھالا اور غزل کی روایت کو زندہ رکھا ان میں ایک اہم نام جوش ملسیانی کا ہے۔ جوش ملسیانی کے علاوہ میلا رام وفا، اودے سنگھ شائق، ساحر لدھیانوی، جگن ناتھ آزاد، کرپال سنگھ بیدار، ساحر سیالکوٹی، نسیم نوزنلی، قیس جالندھری، ہما برناوی، ساحر کپورتھلوی، پریتم خیالی، دلیپ راج، سوہل منگر، رتن پنڈوروی، ہری چند اختر، بسمل کپورتھلوی، امرت لال عشرت، ساحر ہوشیار پوری، کمال کرتار پوری، درد نکودری، کالی داس گپتا رضا، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، عرش ملسیانی، نریش کمار شاد، پورن سنگھ ہنر، رشی پٹیالوی، نوبہار صابر، شباب للت، زار علامی، گوپال متل، منظور حسن نامی، کمال مالیر کوٹلوی، موہن تنویر، پریم وار برٹنی، ساغر شنائی، مہر کیرا، نظیر لدھیانوی، ابن انشا، شودیال سحاب، بعد کی نسل میں جن شعراء نے غزل کی آبیاری کی ان میں راجندر ناتھ رہبر، آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر، امرت پال سنگھ شیدا، رمیش کھوسلہ، جوالا پرشاد، رام رتن مضطر، مہر چند کوثر، بخشش پٹیالوی، ستنام سنگھ خمار، صابر ابوہری،

پرکاش ناتھ پرویز، راج کنول، بلراج کومل، مہندر پرتاپ چاند، گوپال کرشن شفق، پریم پال اشک، کرشن ادیب، تخت سنگھ، خمار جالندھری، ارمان شہابی، نامی نکودری، آزاد گلاٹی، پریم کمار نظر، شرون کمار ورما، ڈاکٹر نریش، عابد سنامی، سرسوتی سرن کیف، گوردیال سنگھ بجائیہ عارف، باوا کرشن گوپال مغموم، کشمیری لال ذاکر، بمل کرشن اشک، سردار پنچھی، پروین کمار اشک، کرشن کمار طور، جگر جالندھری، مترنکودری، کرشن پرویز، عزیز پریہار، جسونت سنگھ راز، وید دیوانہ، کرشن موہن، خالد کفایت، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، اسلم حبیب، محمود عالم، مشتاق وارثی، انوار آذر، انجم قادری، سدرشن کنول، رمضان سعید، ڈاکٹر ناشر نقوی، ڈاکٹر سلطان انجم اور ڈاکٹر محمد رفیع کے نام شامل ہیں۔

موضوع کی اہمیت

آزادی کے بعد پنجاب کی غزلیہ شاعری کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ پنجاب کے غزل گو شعراء نے جہاں تقسیم وطن سے پہلے تحریکِ آزادی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور اپنے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار کیا ہے وہیں آزادی کے بعد ہندوستان کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں عصری تقاضوں اور عالمی پیمانے پر ہونے والی تبدیلیوں کو بھی محسوس کیا ہے اور انہیں تخلیقِ شعروادب کی اساس بنا کر اپنے عصری رجحانات کو پیکرِ شعروادب میں ڈھال دیا ہے۔ چاہے وہ آزادی سے قبل ''انجمن پنجاب لاہور'' کی جانب سے تخلیقِ ادب کے لیے نئی ادبی راہوں کی تشکیل ہو یا آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق کے منشورات، پنجاب کی اُردو شاعری نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والے عالمی پیمانے پر انسانی کرائسس کا اظہار، انسان کی داخلی کیفیات اور خارجی محرکات کی آمیزش نے شاعروں ادیبوں کے تخلیقی جذبات کو مہمیز کیا ہے۔ اس کے ثبوت پنجاب کی غزلیہ شاعری میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند دور میں غزل کے مقابلے میں اُردو نظم اپنے عروج پر پہنچی لیکن غزل بھی اپنی بقاء اور احیاء کے لیے برابر سرگرم عمل رہی اور جب ترقی پسند ادب کے زوال کے بعد جدیدیت کا دور آیا تو پنجاب میں اُردو غزل نئی آب و تاب اور نئے شعری اسلوب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ پنجاب میں جہاں نئے نئے شعری رجحانات نے اپنے اثرات گہرے ثبت کیے ہیں وہیں پنجاب میں روایتی غزل کہنے والے کلاسیکی اور روایتی انداز کی تخلیق کرنے والے شعرا بھی برابر تخلیق ادب میں مشغول رہے ہیں۔ پنجاب میں اُردو غزل کا مطالعہ اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ یہاں روایت اور جدیدیت بیک وقت دونوں دھارے ایک ساتھ چلتے رہے ہیں جہاں ایک طرف روایتی شاعری برابر اپنے وجود و اہمیت کو منواتی رہی ہے۔

وہیں آزادی کے بعد اُردو شاعری کے مزاج میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اُس نے موضوعاتی اور ہئیتی طور پر جو کروٹیں لی ہیں اُن کا پورا احساس پنجاب کے غزل گو شعراء کو بھی رہا ہے اور اس طرح غزل کا ایک ایسا شعری سرمایہ وجود میں آیا جس میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔

غیر منقسم پنجاب کا ادبی ماحول

تاریخ اُردو ادب میں غیر منقسم پنجاب اپنی ادبی خدمات کے باعث ایک نمایاں مقام پر نظر آتا ہے۔آزادی سے قبل پنجاب کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی ماحول کا جائزہ لیا جائے تا کہ پنجاب کے ادبی ماحول کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آ سکے۔ خطہ، پنجاب اپنے تہذیبی اور ثقافتی ماحول کے حوالے سے پوری دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ پنجاب کا نام سنتے ہی ذہن و دل معطر ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سانسوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ ہرے بھرے کھیت آنکھوں کے سامنے لہلہانے لگتے ہیں۔ ندیاں بل کھانے لگتی ہیں اُلھڑ مُٹیاریں اپنے جوبن کا جادو بکھیرنے لگتی ہیں۔ گبھرو جوان بھنگڑہ ڈالنے لگتے ہیں۔ جن کا جوش اور ولولہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ پنجاب کے کلچر کے وہ بنیادی عناصر جو اُسے تمام دنیا سے ممتاز کرتے ہیں، اُن میں رواداری مذہبی اور سماجی سطح پر ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شرکت، کشادہ قلبی، وسیع النظری، جاں نثاری، وفا شعاری اور زندگی کو جی بھر کر جینے کی خواہش روحانی ارتفاع، جاہ و جلال اور جسمانی شکوہ و جمال شامل ہیں۔ درج ذیل سطور میں راجندر سنگھ بیدی نے پنجابی کلچر کی جس طرح مکمل اور بھرپور عکاسی کی ہے اُس سے پنجاب اپنے واضح خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے اُبھرتا ہے۔

''وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اُٹھتی ہے۔ اس کے دریا تو ایک طرف پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔ جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھگڑالو۔ وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی انہیں توڑ دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ انہوں نے بہت دُکھ دیکھا ہے۔ انہوں نے اپنی ماؤں اور

بہنوں کی عزت دی ہے پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے
کے لیے۔ وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اُس مٹی کو
کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں۔ عجیب کیمیا گر ہیں وہ پنجابی
ہی ہے جو اپنے آپ پر ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور بُرا دشمن۔ جہاں
بھی لوگ تمہیں ایک بُلند آواز سے ہنستے قہقہہ لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں
ضرور کوئی پنجابی ہوگا۔ وہ جو اندر ہے وہی باہر۔ اس کے جیون کا رہسیہ ہی یہ
ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں۔ وہ ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ
سکتا ہے۔ اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ و دل میں سما گئی ہے اور
ہواؤں کی مستی دماغ میں۔ پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے نہ معلوم
انہوں نے کون سی امر کتھا سنی ہے۔ جس میں وہ اونگھ بھی گئے اور پا بھی گئے، پی
بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپسیا پوری
نہیں ہوتی۔ ہنسنے کھیلنے کھانے اور پینے میں اُن کا موکش ہے''[1]

اُردو زبان و ادب میں پنجاب کی اہمیت کو واضع کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''اُردو کی روایت اور تاریخ میں پنجاب اُسی طرح شامل ہے جس طرح انسانی
رگوں کے اندر دوڑتے تازہ خون میں سُرخ و سفید جسیمے''[2]

پنجاب اور پنجاب کے کلچر کو صُوفیائے کرام کا دستِ شفقت اور دُعائیں حاصل رہی ہیں۔ اُن
کی تعلیمات نے یہاں کے کلچر کو مخصوص ابعاد عطا کیے ہیں بقول پروفیسر آزاد گلاٹی:

''صوفیائے کرام کے فیض نے پنجاب کے کلچر کو سبھی دھرموں کے باہمی
اتصال و احترام کا جو کردار عطا کیا وہ اُردو میں اس قدر نمایاں ہے کہ خود اردو
پنجاب کے مشترکہ کلچر کی وراثت بن گئی ہے۔ اُردو کے دامن پر ہندوؤں،
مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں نے مل کر جو نقش و نگار بنائے ہیں انہوں نے
اُسے پنجابی کلچر کا ایک دِلکش PATTERN بخشا ہے اور اردو ادب میں

اُن گلابوں کی مہک سموئی ہے جن کی جڑیں سرزمین پنجاب میں پیوست ہیں اور جن کے رنگ اور مہک میں پنجاب کی مٹی یہاں کے پانیوں اور ہواؤں کی تاثیر ہے۔ جیسا کہ وزیر آغا نے لکھا ہے ''جب پنجاب کا ادیب اردو زبان میں لکھتا ہے تو اپنی جنم بھومی کی ساری بو باس، مزاج اور لہجے کو اُردو میں منتقل کرنے پر مجبور ہوتا ہے'' اگر اردو ادب سے پنجاب کی بو باس منفی کردی جائے تو اس میں تنوع اور دل چسپی کے کتنے ہی ابعاد منفی ہو جائیں گے''[3]

پنجاب میں اُردو ادب کو فروغ دینے اور اُردو کے لیے ماحول سازگار کرنے میں یہاں کے لوک ادب نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، سسّی پنوں، مرزا صاحباں، پورن بھگت، اور روپ بسنت وغیرہ کے قصوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا۔ جس سے پنجاب کا کلچر اُردو میں منتقل ہونے لگا۔ پنجاب کے صوفی شعراء مثلاً وارث شاہ، بُلھے شاہ، شاہ حسین اور بابا فرید وغیرہ نے اپنا زیادہ تر کلام اُردو ہی میں تحریر کیا۔

اُردو زبان وادب کا شاید ہی کوئی ایسا دور گذرا ہو جس میں پنجاب نے اپنا حصہ نہ ڈالا ہو۔ پنجاب اپنی تمام تر ثقافتی توانائی اور آب وتاب کے ساتھ تاریخِ اردو زبان وادب کی رگ رگ میں جاری وساری ہے۔ اردو اور پنجاب کے رشتوں کو تاریخی وثقافتی پس منظر میں سمجھنے کے بعد ضروری ہے کہ پنجاب کی اُن ادبی خدمات کا بھی ذکر کیا جائے جنھوں نے اُردو ادب کو اس قابل بنایا کہ آج اُردو ادب کسی بھی زبان کے ادب سے آنکھ ملا سکتا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اُردو کے مورخین پنجاب کی ادبی خدمات کو نظر انداز کرتے آئے ہیں اور وہ کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہو پائے۔

ڈاکٹر کیول دھیر ناشر نقوی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو مورخین نے پنجاب کو نظر انداز کیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے اُردو کا پہلا بڑا شاعر شاہ مبارک آبرو (1638-1737) کو مانا ہے جبکہ شمالی ہند کے شاعر محمد فضل جو نارنول کے تھے ان کی اردو مثنوی

''بکٹ کہانی'' ولی سے پہلے 1625ء میں شائع ہو چکی تھی اور بکٹ کہانی، سے بھی پہلے اجے چند بھٹناگر کی مثنوی ''مثل خالقِ باری'' 1551ء میں شائع ہو چکی تھی۔ افضل اردو میں ''بارہ ماسہ'' کے بھی موجد ہیں۔ ان تاریخوں کی روشنی میں اردو شاعری کے آغاز کی کڑیاں پنجاب سے جڑی ہوئی ملتی ہیں۔ افضل ہی کے ہم عصر جعفر زٹلی (1713 - 1659) پانی پت ہیں جنھیں اردو کا پہلا طنز و مزاح نگار اور انقلابی شاعر مانا گیا ہے۔ یہ بھی پنجاب ہی کے شاعر تھے۔ اسی عہد کے نامور شاعر ناصر علی سرہندی (1696) بھی ہیں۔ یہاں ہم پنجاب کے اُن شعراء کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو باقاعدہ تو اردو کے شاعر نہیں ہیں لیکن انھوں نے اس دور میں اپنی پنجابی شاعری کے ساتھ ساتھ اس وقت کی اردو میں بھی شاعری کی۔ مثال کے طور پر گورونانک صاحب کی نظمیں ''حاضر نامہ'' اور ''سہ حرفی'' اپنے عنوانات سے ہی اردو کی نظمیں ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ گورونانک صاحب اور اُن کے بعد دوسرے گورو صاحبان نیز پنجاب کے صوفی سنتوں کی شاعری کا اردو ادب کی تاریخ میں کہیں کوئی ذکر نہیں ہے''[۲]

انیسویں اور بیسویں صدی کو ہندوستان کی تاریخ میں، بالخصوص اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان صدیوں میں کئی سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی، دینی و مذہبی لامذہبی اور ادبی تحریکات پیدا ہوئیں۔ پوری دنیا میں نئی تحریکات و رجحانات، انقلابات پیدا ہو رہے تھے۔ نئے نئے تجربات کیے جا رہے تھے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی سطح پر پیدا ہونے والے تغیرات و نظریات کا اردو ادب پر بھی گہرا اثر پڑا۔ بدلتے ہوئے حالات اور عصری تقاضوں کے پیشِ نظر ادب میں بھی تجربے کیے جانے لگے۔ فرسودہ اور بے جان روایتوں کو توڑا گیا۔ انسانی اور اخلاقی قدروں کو فروغ دیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑا گیا۔

انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کیے گئے۔ ہر قسم کے استحصال کی مخالفت کی گئی۔ عالمی امن کی ضرورت پر زور دیا گیا ادب برائے زندگی اور ادب برائے اصلاح کا نظریہ پیش کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستان کی آزادی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے سیاسی، سماجی، مذہبی تعلیمی اور ادبی جمود کو توڑنے میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اہلِ ہند کی زندگیوں میں جو بیداری، حرکت اور حرارت پیدا ہوئی وہ غدر سے پیدا شدہ حالات ہی کا نتیجہ ہے۔ جنگِ آزادی کی اس پہلی لڑائی نے نہ صرف اہلِ پنجاب کو بیدار و متحد کیا بلکہ تمام ساکنانِ وطن کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کو بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر عصری تقاضوں پر قلم اُٹھانے کے لیے مجبور کیا۔ نوجوانوں کو فکری و عملی طور پر متحد و متحرک کیا۔ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو قومی یک جہتی اور ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے اُبھارا۔

پہلی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی ہار کے بعد پنجاب کے شعراء میں جذبہء وطن پرستی اور بھی شدّت اختیار کر گیا۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کو کامیاب بنانے اور مذہبی منافرت ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ پنجاب کے شعراء نہ صرف یہ کہ تحریکِ آزادی کے تمام واقعات و سانحات کی عکاسی اپنی شاعری کے حوالے سے کی بلکہ ماضی اور حال کی بنیاد پر مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے بھی آگاہ کیا اور قومی یکجہتی کے جذبات کو اُبھارا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(اقبالؔ)

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

(ظفر علی خاں)

نپٹتے آئے ہیں آپس میں اور اب بھی نپٹ لیں گے
اگر تم بن کے ثالث بیچ میں اِن کے نہ آدھمکو

(ظفر علی خاں)

غدر کے فوراً بعد کا دور مغلیہ حکومت کے زوال کا دور ہے۔ مرکزی حکومت کے ختم ہونے کے بعد ریاستی حکومتیں اندرونی سازشوں کی وجہ سے کمزور پڑ چکی تھیں، ملک بھر میں انتشار پھیل چُکا تھا۔ ہر طرف بدامنی، بدنظمی، مذہبی منافرت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ ہندوستانی اقوام انگریزوں کی ناپاک حرکتوں اور گھناؤنی چالوں کا شکار ہو چکی تھیں۔

دراصل انگریز ہندوستان پر اپنا تسلّط قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اپنے اِسی سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کی پالیسی اپنائی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے انھوں نے مذہب کو حربے کے طور پر استعمال کیا اور وہ کافی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ انگریزوں کے ذریعے پھیلائے گئے مذہبی تعصب اور نفاق کا فوری طور پر لازمی اثر یہ ہوا کہ لاتعداد تہذیبوں، عقیدوں اور مذہبوں کے ماننے والے لوگ جو صدیوں سے آپس میں مل جل کر رہتے آرہے تھے ایک دوسرے کے مذہب کا عزّت و احترام کرتے تھے اور بلاتفریقِ مذہب و ملت ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں اور تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ پیروں، فقیروں سادھوں، سنتوں کی تعلیمات پر عمل کرنے والے، انسان دوستی اور بھائی چارے کا پیغام دینے والے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے والے۔ امنِ انسانیت کے علم بردار انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہو کر مذہبی تعصب کی بنیاد پر ہندو مسلم سکھ اور مندر و مسجد کے خانوں میں بٹ گئے جس کا فائدہ انگریزوں کو پہلی جنگِ آزادی یعنی غدر کی کامیابی کی صورت میں ہوا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے سبھی فرقوں کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پروکر از سرِ نو جنگِ آزادی کے لیے متحد کر کے لڑنے کے لیے تیار کرنے کی سخت ضرورت تھی تا کہ قومی شعور کو بیدار کر کے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرایا جا سکے۔ اس مقصد کو

حاصل کرنے کے لیے پنجاب کے اردو شعرا و ادبا ء نے جو سیکولر کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے ہندوستانی عوام میں قومی یکجہتی پیدا کرنے ،قومی و سیاسی شعور بیدار کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی اہمیت پر پنجاب کے جن شعرا ء نے زور دیا اُن میں حالیؔ، اقبالؔ اور تلوک چند محروم کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ حالیؔ پہلے شاعر تھے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے قومی یک جہتی کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا۔ حالیؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد و یگانگت پر زور دے کر مساوات اور قومی یکجہتی کے جذبات کو اُبھارا اور باہمی اختلافات وتفرقات کو ملک کی آزادی اور فلاح و بہبود کے لیے ختم کرنے کا صحت مند پیغام دیا۔ حالیؔ کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ جب تک اہلِ ہند مذہبی تعصب ،نفرت اور عداوت کو چھوڑ کر پیار و محبت مذہبی رواداری اور خلوص کو نہیں اپنائیں گے ملک غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوگا۔

مُلک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

حالیؔ کی شاعری میں قوم اور اجتماعیت کا جو تصوّر ملتا ہے وہ حالیؔ سے پہلے کے اُردو ادب میں لگ بھگ مفقود تھا اور کم و بیش ہر شاعر و ادیب اپنے انفرادی جذبات کے اظہار سے مطمئین تھا۔

بقول ڈاکٹر گیان چند

''حالیؔ نے پہلی بار لفظ ''قوم'' کو اہلِ ملک کے معنی میں استعمال کیا ہے'' ۵

پنجاب کے اُردو شعراء ہی نے پہلی بار قومی اور اجتماعی شعور سے اُردو ادب کو روشناس کروایا۔

بقول عبادت بریلوی:

''جس زمانے میں اردو ادب کا آغاز ہوا ہے، اس نے اپنے سفرِ ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں اس وقت سارے ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا زندگی کی نوعیت انفرادی تھی۔ جاگیردارانہ دور نے افراد کے فکر و خیال پر ایسے پہرے بٹھادیے تھے کہ انھیں قومیت اور وطنیت کے اجتماعی تصور کا خیال نہیں آتا تھا۔ زندگی میں کوئی سماجی یا اجتماعی تحریک نہیں تھی، کسی قسم کا معاشی یا اقتصادی نصب العین نہیں تھا۔ کسی طرح کا ملکی یا ملّی لائحہ عمل نہیں تھا۔ شہنشاہیت اور شخصی حکومت نے صدیوں سے اس طرح سوچنے اور غور کرنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اُردو ادب میں اجتماعی شعور ایک زمانے میں نام کو بھی پیدا نہیں ہوا اور اس کا یہ اثر ہے کہ عرصے تک اس میں حُبِ وطن کے اجتماعی تصورات کی روایت قائم نہ ہوسکی۔[۵]

حالؔی کو اس بات کا گہرا شعور تھا کہ جب تک لوگوں میں حُبُ الوطنی کے جذبات کو اُبھارا نہیں جائے گا اُن میں اتحاد و اتفاق پیدا نہیں ہوگا ایک طرف جہاں ہندوستانی عوام غفلت کی نیند سو رہے تھے وہیں دوسری طرف اُردو کے بیشتر شعراء ایسے تھے جو ادبی حلقہ بندیوں میں اسیر تھے اور دلّی اور لکھنؤ ہی کی محبت میں گرفتار تھے یا زیادہ سے زیادہ آس پاس کے کچھ علاقوں ہی سے اُن کو محبت تھی۔ سارے جہاں کے درد سے انھیں کوئی سروکار بھی نہیں تھا۔ وہ شہرِ آشوب کی شکل میں دل اور دلی کا مرثیہ اور معاشرے کے زوال پر ماتم تو کر سکتے تھے لیکن جذبہء حُبُ الوطنی کے فقدان کے سبب اُن کا قلم وطن دوستی اور قومی اتحاد کے گیت نہیں لِکھ سکتا تھا۔

پروفیسر آزاد گلاٹی کے لفظوں میں:

''اُس دور کی اردو شاعری میں وطن پرستی کا اظہار اُنہی علاقوں اور سرزمینوں کی تہذیب و معاشرت سے اُنس و محبت کی شکل میں اُبھرا ہے چوں کہ اُس عہد کے

افراد میں معاشرے کو بہتر بنانے کی سکت نہیں تھی وہ اُس عہد کے معاشرے کے زوال کا مرثیہ ہی لکھ سکتے تھے اس کی مثال میرؔ کی غزلوں اور سوداؔ کے شہر آشوب میں ملتی ہے۔[6]

میرؔ اور سوداؔ کے عہد کا ہندوستان غالبؔ کے عہد تک آتے آتے کئی کروٹیں لے چکا تھا۔ ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی فضا بدل چکی تھی۔ خارجی حالات اور ذہنی کیفیات کی بدولت لوگوں میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نے لے لی تھی۔ حُب الوطنی کا نظریہ جو میرؔ وسوداؔ کے زمانے میں اپنے محدود معنی میں ہی استعمال ہوتا تھا اب وہ وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا تھا۔ اُس عہد کے شعراء میں اپنے عہد کا مرثیہ لکھنے کے بجائے قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔
بقول وزیر آغا:

"حُب الوطنی کی ایک فعال تحریک کے تحت شاعری کو وطن کی دھرتی اور اُس کے مظاہر سے قریب تر کرنے کی ایک رَو وجود میں آ گئی تھی"۔[7]

اس رَو کو وجود میں لانے کا سہرا بھی پنجاب ہی کے سر ہے۔ بلا شبہ حالیؔ ہی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قومی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ حالیؔ کے پہلے دور کی شاعری قومی شاعری کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ حالیؔ کی نیچرل قومی اور اصلاحی شاعری سرسیّد کی ادبی تحریک ہی کا حصہ ہے۔ سرسیّد کے ایما پر ہی حالیؔ نے "مُسدسِ حالیؔ" جیسی معرکۃ الآرا نظم تصنیف کی جس کے دیباچہ میں اُردو شاعری کے اصولوں اور موضوعات واسلوبیات سے متعلق تنقیدی نقطۂ نظر سے مفصّل بحث کی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ اس قدر شاندار اور ضخیم تھا کہ اسے الگ سے ایک کتاب کی شکل میں "مقدمہ شعروشاعری" کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اُردو داں طبقے نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور متفقہ طور پر اسے اردو تنقید کا نقشِ اوّل تسلیم کر لیا۔ بلاشبہ اردو تنقید نے حالیؔ کے بعد ایک لمبا سفر طے کیا ہے لیکن آج بھی اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے اور اردو کا ہر چھوٹا بڑا نقاد

اپنے تنقیدی اصولوں کو اس کتاب کی روشنی میں جانچتا اور پرکھتا ہے۔ حالؔی اگر ''یادگارِ غالب'' حیاتِ سعدؔی اور ''حیاتِ جاوید'' نہ بھی تصنیف کرتے تو بھی اُن کا نام ''مقدمۂ شعروشاعری'' کے حوالے سے اردو ادب میں زندہ رہتا۔ حالؔی نے ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں جس سلیقہ مندی کے ساتھ شعر کی تنقید کے اصولوں سے بحث کی ہے اور شاعری کے معائب کا بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے پیشِ نظر ہی آل احمد سرور نے اس کتاب کو اُردو شاعری کا پہلا منشور کہا ہے۔ پنجاب کی دھرتی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے حالؔی جیسے سوانح نگار، جدید شاعر اور نقادِ اوّل کو پیدا کیا جس نے آنے والی نسلوں کے لیے ایسے چراغ روشن کیے ہیں جن کی لَو کبھی مدھم نہیں ہوگی۔ حالؔی نے پنجاب میں جدید شاعری کے جو چراغ روشن کیے تھے اُن کی لَو کو اقباؔل نے اپنی شاعری کے ذریعے تیز تر کیا۔ پنجاب کی دھرتی پر حالؔی کے بعد اقباؔل پہلے شاعر ہیں جنھیں عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ اقباؔل کو ایک پیامبر شاعر کے علاوہ شاعرِ مشرق اور حکیم الامّت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اقباؔل ایک فلسفی شاعر تھے جن کی زیادہ تر شاعری اسلامی فلسفے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی بیمار قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور بیماری کی تشخیص ہوجانے کے بعد علاج بھی کیا۔ اقباؔل نے اپنی قوم کو قعرِ مذلّت اور بے حسی سے نکالنے کے لیے اپنی شاعری کے ذریعے اُن کو حرکت وعمل کا حوصلہ بخشا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

حالؔی ہی کی طرح اقباؔل بھی قدیم فلسفۂ حیات کو بدلنے اور صحت مند روایات کی

پاسداری کرنے کے حق میں تھے انھوں نے مغربی تعلیم سے استفادہ کرنے اور مشرقی اخلاقیات کو اپنانے کی تعلیم دی وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی قوم بدلتے ہوئے نظمِ حیات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ترقی کی منزلیں طے کرے۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کُہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

حالؔی نے حب الوطنی کی جو روایت قائم کی تھی اقبالؔ نے اُس کو استقامت عطا کی۔ اُن کے پہلے دور کی شاعری حُبُّ الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے ملک وقوم سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ابتدائی دور کی نظموں میں ''ترانہ ہندی''، ''نیا شوالہ'' اور ''ہمالہ'' وغیرہ حُبِ وطن کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبُلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

قومی اتحاد و یکجہتی کو ملک وقوم کی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے جو جنّت سے نکلواتا ہے آدم کو
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبالؔ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ قومی یکجہتی کا جو شیرازہ انگریزوں نے اپنی شرانگیزیوں سے بکھیر دیا ہے اُسے یکجا کرنا اگرچہ آسان نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کا
جو مشکل ہے تو اِس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

حالی کے ہم عصر محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالی اگر قومی شاعر ہیں تو آزاد قدرتی اور نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر زینت اللہ جاوید:

''جدید شاعری کے بانی اور اردو کے مجدد شمس العلماء محمد حسین آزاد نے ۱۸۶۵ء میں نئی تبدیلیوں کے لیے سب سے پہلا قدم اٹھایا اور اردو ادب میں ایک تنوع اور ایک تغیر کی جسارت کی۔ قدیم ادب کی بے مقصدیت سے دامن کش ہونے اور ادب کو مقصدی بنانے کی پرزور سفارش کی۔ آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے ایما سے ایک ادبی انجمن بھی قائم کی جس کے ماہانہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد بالکل نئے تھے بجائے مصرعہ طرح کے مختلف موضوعات کا اعلان کیا جاتا تھا تا کہ اردو شاعری سے بے جا مبالغہ، تکلف اور فرسودہ خیالات کا انخلا ہو سکے۔ ادب کی قدیم شاہراہ سے انحراف اور نئی قسم کے با مقصد مشاعرے عام کرنے کے لیے آزاد نے مختلف اجلاس اپنے فاضلانہ لیکچروں اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کے اذہان کو تیار کیا اور ثابت کیا کہ یہ رنگ قبولِ عام ہو سکتا ہے ۱۸۷۴ء میں نیچرل شاعری کے افتتاحی مشاعرہ کے موقع پر انھوں نے ایک نہایت عالمانہ ایڈریس پڑھا جس میں قدیم شاعری کے معائب دکھا کر واضح کیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا چاہتے ہو تو عروسِ شاعری کو تیرہ و تار محلوں سے نکالو۔ موجودہ زمانے کی روشنی میں لاؤ۔ سادگی، واقعیت اور درد و اثر بھاشا سے سیکھو اور صاف بیانی اور وسعتِ نظر مغربی شاعری سے مستعار لو آزاد نے خود بھی اردو نظمیں انگریزی نظموں کی طرز پر لکھیں اور مغربی خیالات کو اردو کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی''۔[۸]

حالی اور اقبال کے علاوہ پنجاب میں حب الوطنی کی روایت کو جن شعراء نے آگے بڑھایا اُن میں ایک معتبر نام تلوک چند محروم کا بھی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے مطابق

"یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ قومی اتحاد و یگانگت کے موضوع پر جتنا اور جیسا محرومؔ نے لکھا اتنا اور ویسا کسی نے نہ لکھا ہوگا"۔ 9

پہلی عالمی جنگ کے بعد آزادی کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی ملک کے کونے کونے میں انگریزوں کے خلاف جلوس نکالے جا رہے تھے۔ سیاسی اور عوامی سطح پر جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ آزادی کی اس تحریک نے پنجاب کے اُردو شعراء کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اُن کے جذبۂ قوم پرستی کو اُبھارا۔ تحریکِ آزادی سے ہندو مسلم میں جو اتحاد و اتفاق پیدا ہو چلا تھا انگریز اُس اتحاد سے خوف زدہ تھے اور انھوں نے اِس اتحاد کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی' ہر اُس حربے کا استعمال کیا جس سے اُن کو فائدہ ہو سکتا تھا۔ بالآخر وہ اس اتحاد کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے اور تلوک چند محروم نے نظم "انجامِ اتحاد" میں لکھا۔

کیا مطمئین ہیں اہلِ وطن دیکھیے ذرا
گویا گلے سے طوقِ غلامی اتر گیا

پروفیسر آزاد گلاٹی محرومؔ کی وطن پرستی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

محرومؔ کی وطن پرستی کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ انھوں نے قومی اتحاد کے لیے جس قدر اور جس انداز میں لکھا وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ "آزادی ہے فقط اتحاد کا انعام" جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوا تو محرومؔ نے "شکوۂ صیاد" اور "ڈائر اور نادر" کے عنوان سے نظمیں لکھیں۔ موخرالذکر میں وہ کہتے ہیں کہ:

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک
سفاک اُس کا نام ہے مشہور آج تک

لیکن جورِ نادرِ سفاک کے سِوا
ڈائر کے قتلِ عام کا پُر ہول ماجرا

اور جب ۱۹۲۶ء میں سائمن کمیشن آیا تو محرومؔ نے لکھا۔

عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں
نہیں جانتے اپنا سود و زیاں

نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق
نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق

اور اسی طرح جب سردار بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تو محرومؔ کی وطن پرستی کہہ اٹھی:

زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا
شیدائے وطن، پیکرِ ایثار آیا
ہے دارورسن کی سرفرازی کا دِن
سردار بھگت سنگھ سرِ دار آیا

غرض کہ محروم کی وطن پرستی نے اپنے عہد کی ہر سیاسی تحریک اور واقعات و سانحات کو موضوعِ سخن بنایا اور ملک کی آزادی کے شیدائیوں اور قومی ہستیوں پر متعدد نظمیں بھی لکھیں۔ اُن کی وطن پرستی اُن نظموں سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے براہِ راست وطن کی شان میں کہیں۔ ان میں ''ہندوستاں ہمارا''، ''شامِ وطن''، ''اپنا وطن'' اور ''خاکِ ہند'' وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی غلامی کی تصویر بھی پیش کی تو کچھ اس انداز سے کہ اپنے ہم وطنوں کی غیرت کو اُبھارا۔ محرومؔ بلا شبہ اقبالؔ کے بعد سرزمینِ پنجاب کے اہم قوم پرست شاعر کے طور پر اُبھرے اور اُن کا کلام وطن سے محبت، آزادی کی خواہش، اُس کے حصول کے لیے جدوجہد اور اتفاق و اتحاد کی اہمیت سے مملو ہے۔''[۱۰]

مختصر یہ کہ پنجاب حب الوطنی کے حوالے سے بامِ عروج پر نظر آتا ہے۔ پنجاب

کے اُردو شعراء نے اپنی قومی و وطنی شاعری کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کے دلوں کو گرمایا اور انھیں جدوجہدِ آزادی کے لیے تیار کیا۔ حالؔی، اقبالؔ اور محرومؔ کے علاوہ پنجاب کے اُردو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن کے ہاں وطن پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جن میں ظفؔر علی خاں، حفیظؔ جالندھری، فیض احمد فیضؔ، ساحؔر لدھیانوی، قتیلؔ شفائی، جوشؔ ملسیانی، پنڈت میلا رام وفاؔ، اودے سنگھ شائقؔ، پورن سنگھ ہنرؔ، نو بہار صابرؔ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور جگن ناتھ آزادؔ وغیرہ کے نام اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔

پنجاب کے اُردو شعراء کے علاوہ نثر نگاروں نے بھی اُردو ادب میں گراں قدر حصہ ڈالا ہے۔ پنجاب کے اردو نثری ادب میں ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے اپنے شہ پاروں سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ انیسویں صدی کو اُردو فکشن کا سنہری دور مانا گیا ہے۔ اسی دور میں اردو ناول نگاری کی ابتدا پنجاب کی زمین سے ہوئی۔ ناشرؔ نقوی کے لفظوں میں:

> ''پنجاب سے جہاں حالؔی، محمد حسین آزادؔ اور علامہ اقبالؔ وغیرہ نے بحوالہ شاعری اصلاحی تحریکات شروع کیں وہیں اردو کا پہلا ناول ''ریاضِ دلرُبا'' وجود میں آیا جس کے مصنف منشی گمانی لولی ہیں۔ ''ریاضِ دلرُبا'' ناول ۱۸۳۲ء کی تصنیف ہے۔ یہ ناول پہلی بار متحدہ پنجاب کے روہتک پریس سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کی اصل نقل دوسری اشاعت کے طور پر ۱۹۹۰ء میں ہریانہ اُردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ یہ ناول اب تک اردو تاریخ کے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء، از ڈپٹی نذیر احمد سے چھ برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو ادب کی تاریخ میں ناول نگاری کے نقشِ اوّل کا سہرا پنجاب کے سر ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اور 'ریاضِ دلرُبا'' کے بعد کا زمانہ پنجاب کے حوالے سے اردو ناول اور افسانے کی روشنی میں بظاہر خالی نظر آتا ہے۔ کسی بھی فکشن محقق نے پنجاب کے فکشن

قلمکاروں کا ذکر نہیں کیا۔ ذکر تو ''ریاضِ دلرُ با'' کا بھی نہیں ہوا۔ بہر نوا س ذکر نہ کرنے میں بھی کوئی جانبداری ضرور برتی گئی ہے۔ جبکہ فکشن رائٹینگ کے آغاز سے ہی پنجاب کے قلمکار مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ جن میں امر سنگھ منصور ۱۸۷۵ء، جگت سنگھ ۱۸۸۵ء اور مخمور جالندھری ۱۹۱۵ء کے نام اہم ہیں۔ یہ قلم کار ناول نگار بھی رہے افسانہ نگار بھی اور شاعر بھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ پنجاب کے فکشن قلمکار ڈپٹی نذیر احمد سے رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرؔر، پریم چند اور مرزا ہادی رسواؔ کے دوش بدوش چلتے رہے ہیں۔[۱۱]

ترقی پسند ادبی تحریک' سرسیّد احمد خاں کی علی گڑھ کی ادبی تحریک کے بعد دوسری بڑی ادبی تحریک ہے جس نے تمام ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا اور اردو ادب میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ اس تحریک کی غرض وغایت کے سلسلے میں پروفیسر زینت اللہ جاوید لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۳۵ء میں ترقی پسند انجمن کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اردو ادب کی حسیّت و تفکّر کو عمومی واجتماعی شعور میں یکسر بدل دیا۔ ایک منظم انجمن کے تحت اردو ادب کو بامقصد بنانے کے لیے ادباء وشعراء نے اپنے فن کے ذریعہ سماج کے معائب ونقائص کو شعری حسن عطا کیا اور افلاس، غلامی اور جہالت کے خلاف جہاد شروع کیا۔ قدماء کے یہاں آرائشِ بیان وتزئین عبارت ہی سب کچھ تھی۔ موضوع یا مواد اور فکر وخیال کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد بھی یہی تھا کہ ادب زندگی کا ترجمان بن جائے۔ ادیب وشاعر محض اپنے حصارِ ذات ہی میں محبوس ومقید نہ ہوں بلکہ حصارِ ذات توڑ کر ملک وقوم کی رہنمائی کا بیڑا بھی اٹھائیں۔ صرف اپنے ہی غم کا اظہار نہ کریں بلکہ دنیا کے غم کو اپنا غم جانیں۔[۱۲]

ترقی پسند تحریک حالؔی اور آزادؔ کی جدید اور نیچرل شاعری ہی کی توسیع وتوضیح ہے

جس نے ادب کے آفاقی مقصد کو واضح کرتے ہوئے ادب کا رشتہ زندگی کے حقیقی مسائل اور عوام سے جوڑا۔ اس تحریک نے کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت کے اصولوں کی پیروی کی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر پنجاب کے جن قلمکاروں نے ناول لکھے اُن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگر، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، کرتار سنگھ دُگل، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہنسراج رہبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ملکی تقسیم سے جو مسائل پیدا ہوئے۔ اُس کا شدید ردِعمل دونوں طرف کے پنجاب کے قلم کاروں کی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ملکی تقسیم اور خونی فسادات پر جو ناول لکھے گئے اُن میں کرشن چندر کا ''غدار'' اور ''پیشاور ایکسپریس'' خواجہ احمد عباس کا ''چار دِل چار راہیں''، عبداللہ حسین کا ''اُداس نسلیں''، رامانند ساگر کا ''اور انسان مر گیا'' وغیرہ ملکی تقسیم سے پیدا شدہ مسائل کی بھر پور عکاسی کرتے ہیں۔

اُردو افسانے کو بھی پنجاب نے بڑی قد آور شخصیتیں عطا کیں ہیں جن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ممتاز مفتی، خواجہ احمد عباس، دیویندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن تمام افسانہ نگاروں نے ترقی پسند تحریک کا اثر قبول کرتے ہوئے افسانوی ادب تخلیق کیا اور اپنے افسانوں میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور جنسی مسائل کو پیش کیا۔ بعد کی نسل میں جن افسانہ نگاروں نے اس روایت کو آگے بڑھایا اُن میں شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، رام لعل، جوگندر پال، شفیق الرحمن، اشفاق احمد، ممتاز شیریں اور ابراہیم جلیس وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اُردو ڈراما نگاری میں پنجاب کے جن قلمکاروں نے حصہ ڈالا اُن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، اپندر ناتھ اشک، مرزا ادیب، راجندر سنگھ بیدی، امتیاز علی تاج، سرسوتی شرن کیف کے نام کافی اہم ہیں۔

طنز و مزاح نگاری اُردو نثر کی بے حد مقبول صنف ہے اس سلسلے میں بھی پنجاب کا ذکر کیے بغیر اُردو طنز و مزاح کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس میدان میں پنجاب کے جن

ادیبوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور اپنے فن کا لوہا منوایا ان میں کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، کرشن چندر، پطرس بخاری، عبدالعزیز پیا، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، رام لعل نابھوی اور دلیپ سنگھ وغیرہ کے ناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اُردو تحقیق وتنقید بھی پنجاب کا ذکر کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، انور سدید، مالک رام، کالی داس گپتا رضا، گیان چند جین اور آزاد گلاٹی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو صحافت میں بھی پنجاب نے اہم رول ادا کیا ہے۔ سرزمینِ پنجاب سے شائع ہونے والے اُردو اخبارات نے ملک کی آزادی کے لیے جو ماحول اور فضا تیار کی اور برطانوی حکومت کے ظلم وستم کے خلاف جس بے باکی سے لکھا اور حریت پسندی کے جذبات کو اُبھارا وہ اپنی مثال آپ ہے ملک کو آزاد کرانے اور اہلِ ملک کو متحد و متحرک کرنے میں یہاں کے اردو اخبار پیش پیش رہے۔

بقول پروفیسر آزاد گلاٹی:

"یہ اخبار چاہے کسی بھی تحریک' فرقہ اور اندازِ فکر سے وابستہ رہے ہوں لیکن اردو ہی اِن کے خیالات ونظریات کی تبلیغ اور ترویج کا وسیلہ بنی رہی اور اس طرح بھی اُردو نے قومی یکجہتی کے لیے اپنے فرائض ادا کیے"۔[۱۳]

زمیندار، ریاست، کوہِ نور، بندے ماترم، ویر بھارت اور ملاپ، پرتاب ایسے اخبار تھے جو لاہور سے شائع ہوا کرتے تھے۔ ان اخبارات نے جہاں جنگِ آزادی میں حصہ ڈالا وہیں اُردو ادب کی بھی خدمت کی۔ اِن اخبارات کی امتیازی شان یہ تھی اِن میں علمی وادبی مضامین بھی چھپا کرتے تھے۔ اِن اخبارات کی زبان ادبی اور معیاری ہوا کرتی تھی جو مضامین اور کالم اِن میں چھپتے تھے اُن میں طنز ومزاح کی چاشنی موجود ہوتی تھی۔ پنجاب کی صحافت کے تعلق سے ماسٹر محمد کفایت اللہ نے اپنے مضمون "پنجاب کے پرانے اور نئے ادبی مراکز" میں لکھا ہے کہ:

''یہاں پر اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ پنجاب کے صحافتی میدان میں بھی طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ اِن لکھنے والوں میں مولانا ظفر علی خاں (زمیں دار) دیوان سنگھ مفتوںؔ (ریاست) عبدالمجید سالک (انقلاب) مجید لاہوری (نمک داں) مہاشہ کرشن (پرتاپ) حکیم یوسف حسن خاں (نیرنگِ خیال) اور مولانا چراغ حسن حسرتؔ (شیرازہ) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا تاجورؔ نجیب آبادی اور حاجی لق لق جیسے نام بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں''۔[۱۴]

پنجاب کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ ''انجمن پنجاب'' جیسی ادبی انجمن کا قیام سب سے پہلے لاہور میں عمل میں آیا وہیں اس بات پر بھی فخر ہے کہ آزادی سے پہلے سب سے زیادہ ادبی انجمنیں اسی سرزمین پر قائم ہوئیں۔ اِن انجمنوں کے تحت نہ صرف یہ کہ کل ہند سطح کے مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے بلکہ افسانوی ادب پر تنقیدی نقطۂ نظر سے بحث ہوا کرتی تھی ''انجمن پنجاب لاہور'' کے بعد ''بازارِ حکیماں کی انجمن'' کا ذکر بھی لازمی ہے۔ جس کے تحت باقاعدگی کے ساتھ مشاعرے ہوا کرتے تھے اس انجمن کو ارشد گورگانی کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہی وہ انجمن ہے جس کے ایک مشاعرے میں علاّمہ اقبالؔ کا ایک شعر سننے کے بعد ارشد گورگانی نے اقبالؔ کے ایک عظیم شاعر ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

غیر منقسم پنجاب میں لاہور سب سے بڑا ادبی مرکز تھا۔ جہاں بے شمار انجمنیں قائم تھیں اور شعر و سخن کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ ان ادبی انجمنوں میں ''انجمنِ پنجاب'' اور ''بازارِ حکیماں'' کے علاوہ ''انجمنِ حمایت اسلام'' اور ''انجمنِ اربابِ علم'' کا ذکر ناگزیر ہے۔

انجمنِ اربابِ علم کے صدر محسن عبدالقادر تھے اور مولانا تاجور نجیب آبادی اس انجمن کے سر پرست تھے۔ اس انجمن سے وابستہ افراد میں پنڈت میلا رام وفا، سردار ہُڈے سنگھ شائق اور نوجوان نسل میں کرپال سنگھ بیدار، پورن سنگھ ہنر، احسان دانش، اختر شیرانی اور جگن ناتھ آزاد کے نام مشہور ہیں۔ اس انجمن کے تحت ہونے والے مشاعروں میں مقامی شعراء کے علاوہ ہندوستان کے کئی بڑے شاعروں نے بھی شرکت کی۔ جن میں جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملسیانی اور جگر مرادآبادی کافی مشہور و معروف نام ہیں۔ مولانا تاجور نے ایک دوسرا اہم کام یہ کیا کہ لاہور ہی میں ادبی مرکز کے نام سے ایک تصنیفی ادارہ قائم کیا جس کا مقصد نثر و نظم کا منتخب ادب شائع کرنا تھا۔ اس کام میں تعاون دینے کے لیے انھوں نے جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، سیماب اکبرآبادی، یاس یگانہ چنگیزی اور شہاب مالیر کوٹلوی جیسی شخصیات کو لاہور مدعو کیا۔

لاہور ہی میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انگریزی ادب سے اثر قبول کرنے کے بعد اردو شاعری میں جدید راہیں تلاش کر رہا تھا اس گروہ نے اپنے لیے ایک الگ اور نئی انجمن قائم کی اور اُس کا نام "نیازمندانِ لاہور" رکھا۔ اس انجمن کے روحِ رواں تھے ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور اس میں شامل ہونے والے شاعروں اور ادیبوں میں حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، پنڈت ہری چند اختر، صوفی غلام، مصطفی تبسم، چراغ حسن حسرت اور حکیم احمد شجاع وغیرہ کے نام اُردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ لاہور کے ہی چند دانشورانِ علم و ادب نے ایک بزم "بزمِ داستاں گویاں" کے نام سے قائم کی جو آگے چل کر "حلقہء اربابِ ذوق" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس بزم کی نشستیں اِس سے وابستہ افراد کے گھروں پر ہی اتوار کو منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس بزم کے تحت منعقد ہونے والے جلسوں میں اصنافِ ادب کی جو بھی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں اُن پر تنقید بھی ہوا کرتی تھی اس حلقہ کے سر گرم ارکان ن۔ م۔ راشد، میراجی، حفیظ ہوشیارپوری، مولانا صلاح الدین، تابش صدیقی، تصدق حسین خالد، قیوم نظر، یوسف ظفر، ناصر کاظمی، یوسف علی عابد، راجندر سنگھ بیدی،

کنھیالال کپور، اوپندر ناتھ اشک، شیر محمد اختر، اعجاز حسین بٹالوی، انتظار حسین اور سیّد امجد حسین تھے۔

آزادی سے قبل پنجاب میں لاہور کے علاوہ ایسے بہت سے مقامات تھے جہاں ماہانہ اور ہفتہ واری ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان کی نامی گرامی شخصیتیں شرکت کیا کرتی تھیں۔ پنجاب کا شاید ہی کوئی شہر ایسا رہا ہو جہاں پر ''انجمنِ اردو'' یا ''بزمِ ادب'' نام کی انجمنیں قائم نہ ہوں جہاں پر ادبی محفلیں نہ جمتی ہوں۔ امرتسر اور لاہور میں تو ہر سال کُل ہند سطح کے مشاعرے ہوا کرتے تھے بعد میں جن کی دیکھا دیکھی ملک بھر میں مشاعرے ہونے لگے۔ لاہور اور امرتسر کے علاوہ جالندھر اور نکودر میں ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی کی سرپرستی میں 'بزمِ ادب' اپنی ادبی سرگرمیوں میں سرگرمِ عمل تھی۔ جوشؔ ملسیانی داغؔ اسکول کے نمائندہ شاعر تھے جن کے شاگردوں کی کثیر تعداد ہے جن میں نسیم نورمحلی، کمالؔ کرتارپوری، دردؔ نکودری، ساحرؔ سیالکوٹی، ہماؔ ہرنالوی، سادھو سنگھ ہمدرد، امر چند قیسؔ بزم کے سرگرم رکن تھے۔ جوشؔ ملسیانی کے ہی ہم عصر لسان الاعجاز پنڈت میلارام وفاؔ نے جالندھر ہی میں بزمِ سخن قائم کی۔ جس کے جنرل سیکریٹری پریمؔ ضیائی تھے۔ وفاؔ صاحب کا تلامذہ بھی کافی وسیع تھا جس میں شیودیال سیمابؔ، رام رتن مضطرؔ، امید پٹھانکوٹی، اخترؔ ہرے واسیہ، بدری ناتھ کاملؔ، راجنؔ سرحدی اور کملؔ میرٹھی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے پٹیالہ میں بھی لٹریری لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم تھی جس کے روحِ رواں نو بہار صابر تھے بعد میں اس انجمن کا نام بدل کر ''انجمنِ ترقی اُردو'' (ماڈل ٹاؤن) پٹیالہ کردیا گیا۔ مالیرکوٹلہ پنجاب کا واحد ایسا شہر ہے جو آزادی سے قبل بھی اُردو کی تعلیم اور شعروادب کے ماحول کو فروغ دینے میں لگا ہوا تھا اور آج ناساعد حالات میں بھی اُردو زبان وادب کی آبیاری کر رہا ہے۔ آزادی سے قبل یہاں پر بزمِ ادب اور بزمِ ترقیِ ادب کے نام سے دو ادبی انجمنیں قائم تھیں جن کی سربراہی علی

التر تیب علامہ شیخ بشیر حسن بشیر اور مولانا عبد السلام خاں جلال مرزا خانی کیا کرتے تھے یہاں ماہانہ طرحی نشستوں کے علاوہ سالانہ عظیم الشان مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے اور آج جبکہ ملک کو تقسیم ہوئے چھ دہائیاں گزر چکی ہیں یہ شہراب بھی مختلف ادبی تنظیموں کے ذریعے اردو شعر و ادب کی پاسداری کر رہا ہے۔

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	پر بودھ اور میئتری مشمولہ ''آجکل'' دہلی اکتوبر ۱۹۸۴ء	راجندر سنگھ بیدی	۱۵ور ۲۲
۲۔	تاریخِ اُردو ادب (حصہ اوّل)	جمیل جالبی	۶۲
۳۔	اذکار	آزاد گلاٹی	۴۳
۴۔	''کتاب نما'' جولائی ۲۰۰۴ء	ڈاکٹر کیول دھیر	۷
۵۔	اظہار	آزاد گلاٹی	۱۱
۶۔	اُردو شاعری میں وطن پرستی کی روایت	عبادت بریلوی	۱۴۹
۷۔	اظہار	آزاد گلاٹی	۹
۸۔	اُردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا	۳۳۰
۹۔	تلوک چند محروم: شخصیت اور فن	ڈاکٹر زینت اللہ جاوید	۴۱_۴۲
۱۰۔	محروم کی شاعری ''شانِ ہند'' دہلی جنوری ۱۹۶۸ء	گوپی چند نارنگ	۲۱
۱۱۔	کتاب نما جولائی ۲۰۰۴ء	ڈاکٹر کیول دھیر	۹_۱۰
۱۲۔	تلوک چند محروم: شخصیت اور فن	ڈاکٹر زینت اللہ جاوید	۴۹
۱۳۔	کتاب نما، جولائی ۲۰۰۴ء	ڈاکٹر کیول دھیر	۱۲
۱۴۔	پنجاب میں اردو ادب	پروفیسر زینت اللہ جاوید	۱۲۶

آزادی کے بعد پنجاب میں اردو غزل

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا تو ملک کے ساتھ ساتھ پنجاب بھی دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ مغربی حصّہ پاکستانی پنجاب اور مشرقی حصّہ ہندوستانی پنجاب کہلایا۔ تقسیم کے وقت اگر سب سے زیادہ نقصان کسی صوبے کا ہوا تو وہ پنجاب ہی تھا۔ آتش زنی اور خوں ریزی کا وہ کھیل کھیلا گیا جس سے انسانی روح کانپ اُٹھی اور پورا پنجاب خون میں نہا گیا۔ ہندوستان کو صبحِ آزادی نصیب تو ہوئی مگر ظلمتوں میں گھری ہوئی۔ انسان اور انسانیت کے خون میں نہائی ہوئی بقول فیضؔ

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ہمیں آزادی کی قیمت اپنا خون اور ماؤں بہنوں کی عصمت دے کر چکانا پڑی۔ ملک کی آزادی کے لیے لاکھوں ماؤں، بہنوں اور عورتوں نے اپنے بیٹوں، بھائیوں اور اپنے سہاگ کی قربانیاں دیں اور آزادی کو روتے مسکراتے ہوئے گلے لگایا۔ آزادی ملی مگر ملکی تقسیم کے ساتھ۔ ہند کو مذہبی اور لسانی بنیاد پر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اُردو جو ہندی ہی کی طرح ہندوستان کی بیٹی ہے یہیں پیدا ہوئی پلی بڑھی اور جوان ہوئی اُسے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اپنے ہی گھر میں بے گھر کر دیا گیا۔ بقول ساحرؔ

جن شہروں میں گونجی تھی غالبؔ کی نوا برسوں
اُن شہروں میں اب اُردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیٔ کامل کا اعلان ہوا جس دم
معتوب زباں، ٹھہری، غدّار زباں ٹھہری

وطن کی آزادی کے لیے ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دینے والی اردو زبان تہذیب وتمدن کی امین اور امن وآشتی کی ضامن وعلم بردار آج اپنے ہی گھر میں بے گھری کی زندگی جینے پر مجبور ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی زبان نے دنیا کی ملکی سرحدوں کی قید کو قبول نہیں کیا ہے۔ زبان کوئی بھی ہو جہاں کہیں بھی اُسے سازگار ماحول اور اپنے چاہنے والے ملتے ہیں وہاں وہ زبان خود بخود پنپتی رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم کے وقت ہمارے بہت سے شاعر و ادیب ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور وہاں کے شاعر و ادیب ہندوستان آگئے۔ پاکستان سے ہجرت کر کے جو شعرا و ادبا ہندوستان آئے اُن میں بیشتر پنجاب اور نواحِ پنجاب کے علاقوں میں مقیم ہو گئے لیکن اُردو کے قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جنہوں نے یہیں رہنا پسند کیا اور نامساعد حالات میں بھی اُردو کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اِسے سنبھالا اور سہارا دیا اور اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بھی کافی حد تک بحال کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد جہاں ایک طرف سارا ملک آزادی کے جشن منانے میں مصروف تھا وہیں پورا پنجاب تقسیم کی شکل میں ملنے والی آزادی پر خون کے آنسو بہا رہا تھا اور زخم خوردہ آزادی پر ماتم کر رہا تھا۔ وہی لوگ جو وطن کو آزاد کرانے کے لیے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے ہندوستان تقسیم ہوا تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، مارکاٹ کا وہ بازار گرم ہوا کہ پورا پنجاب فسادات کے شعلوں میں جلنے لگا۔ شہر در شہر گھروں کو جلایا گیا۔ عصمتیں لوٹی گئیں، لاکھوں لوگوں کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ پنجاب کے قلم کاروں نے انسانیت کو حیوانیت میں بدلنے کا یہ ہولناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ فسادات کے موسم کو جھیلا اور ہجرت کے کرب کو برداشت کیا ہے اسی لیے جب ہم آزادی کے بعد کی غزل کا بحیثیتِ مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پنجاب کی شاعری باقی ہندوستان کی شاعری سے مختلف نظر آتی ہے۔ شمالی ہندوستان کی غزلیہ شاعری میں غمی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد کے پنجاب کی غزلیہ شاعری ملکی

تقسیم، فسادات اور ہجرت کے زخموں سے چور نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پنجاب میں ہونے والی اُردو شاعری انتشار، خوف و ہراس، بے چہرگی، بے گھری، تنہائی ذات کی نا آسودگی، زندگی کی شکست و ریخت، بے یقینی، درد و کرب، بے گھری اور بے سروسامانی کے جذبات اور احساسات سے بھری پڑی ہے۔

آدمی بننے میں جب دشواریاں آئیں نظر
کوئی ہندو بن گیا کوئی مسلماں بن گیا

(صابرؔ ابوہری)

خبر نہیں بات کیا ہے، جس سے، چمن کے آنسو نکل پڑے ہیں
نہ جانے کیا کچھ بتا گیا ہے، چمن کو یہ صبح کا ستارا

(جگن ناتھ آزادؔ)

رنگِ چمن اُداس کبھی اس قدر نہ تھا
ہر ایک پھول دیدۂ حیراں ہے آج کل

(جوشؔ ملسیانی)

آزادی سے قبل ساحرؔ لدھیانوی نے کہا تھا کہ:

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم
کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

(ساحرؔ لدھیانوی)

لیکن جب خون میں نہائی ہوئی آزادی ملی تو وہ تمام خواب چکنا چور ہو گئے جو اہل ہند نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ جس صبحِ درخشاں کا خواب اہلِ ہند نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آزادی کے چہرے پر خونی لکیریں کھنچ گئیں اور دامن تار تار ہو گیا۔

بقول بشیر بدر:

''عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ آزادی کے بعد ملک سے ویرانی، تاراجی، غربت اور افلاس ختم ہو جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات بہ آسانی مل جائیں گی، ایک بہار کا عالم ہوگا، ناانصافیوں کا اندھیرا نہ ہوگا۔ لیکن غزل میں آزادی کے بعد ہندوستان کا جو نقشہ اُبھرا وہ کچھ اس طرح ہے۔ موسمِ گل کا یہ فریب ہے کہ زخم پھول نظر آتا ہے آزادی کا چراغ بے نور ہے۔ باغ میں ویرانی ویرانی ہے، رہبرانِ وطن نے آزادی کے نام پر ہمیں دھوکہ دیا ہے، پھول مسلے اور شمعیں بجھی ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے غریب کے لیے کھانے کو صرف آزادی کا نام ہے''۔[1]

آزادی کے بعد جو منظر اُبھرا اُس نے ہمارے شاعروں کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا۔ دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا جو انسانیت سوز المیہ پیش آیا اُس نے آزادی کی صبحِ درخشاں کے ساتھ ساتھ انسانیت کے ڈوبتے ہوئے سورج کا لہولہان منظر بھی دِکھا دیا۔ اس المیہ نے ہمارے شاعروں کو بُری طرح مضطرب اور بے چین کر کے رکھ دیا۔

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری
زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری
یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری

(ساحرؔ لدھیانوی)

ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والے خون خرابے اور قتل و غارت گری کی ذمہ داری دونوں طرف کے لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ کسی ایک طرف کے لوگوں کو اس کا ذمہ دار

نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اِن حالات میں سیاسی لیڈروں کی تقریروں اور فریب کاریوں نے آگ میں گھی چھڑکنے کا کام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کے ہندو اپنا دھرم اور مسلمان اپنا ایمان بھول گئے اور ساحرؔ جیسا شاعر کہہ اُٹھا۔

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے ابتک
مگر اِس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آگئے لیکن
خُدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

(ساحرؔ لدھیانوی)

اس ضمن میں ندؔا فاضلی کے یہ دو شعر بھی بڑے سچے معلوم ہوتے ہیں:

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی
ہندو بھی مزے میں ہے مسلماں بھی مزے میں
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

(ندؔا فاضلی)

ہندوستانی عوام کو یہ پختہ یقین تھا کہ اُن کو آزادی کی صورت میں ''فردوسِ گم گشتہ'' ملنے ہی والی ہے لیکن جیسے ہی آزادی کا اعلان ہوا تو اُن کا یہ خواب، خوابِ پریشاں ثابت ہوا۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

''آزادی کے اعلان نامہ کی سیاہی خشک بھی نہیں ہونے پاتی کہ آزادی کی صبحِ کاذب پر تاریکی پھر یورش کرتی ہے۔ جو انقلاب خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر آزادی کی نوید لے کر آیا تھا اس کے بعد میں قتل و خون، غارت گری، آتش زنی، عصمت دری اور اغوا کا ایسا بے پناہ سیلاب آیا کہ تاریخ میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ شرم و حیا، اخلاق و شرافت، ہمدردی، رحم ایثار، اخوت کے

سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ آزادی کی بزمِ طرب میں نغمۂ نشاط کی جگہ ایک پُر سوز اور المناک نوحہ بلند ہونے لگا جس میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عصمت کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اس طوفان میں بوڑھوں کی بزرگی۔ جوانوں کی رعنائی، بچوں کی معصومیت سب درندگی کی قربا نگاہ پر بھینٹ چڑھ گئیں۔ اور پھر ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس مٹی سے خمیر اُٹھا تھا اور جہاں کی خاک میں اُن کے آباواجداد کی ہڈیاں دفن تھیں وہ خاک اُن کا دامن کھینچ رہی تھی لیکن یہ سیلاب انہیں کمزور تنکوں کی طرح بہاتا چلا گیا۔ دِلی کا لال قلعہ، شاجہاں کی مسجد، آگرہ کا تاج محل لاہور کا شالا مار، گنگا اور جمنا کے کنارے، راوی اور چناب کی رومان پرور موجیں انہیں پکارتی رہیں لیکن وہ نہ رُک سکے۔ شہر سنسان ہوگئے گنگناتی ہوئی نہریں اُداس ہوگئیں۔ نئی راہوں سے گذرتے ہوئے لاکھوں قافلے نئے نئے دیسوں میں پہنچے۔ نئے دیس کی نئی راہیں نئے گلی کوچے اور نئی آوازیں اپنی اجنبیت کا سامان لئے ہوئے تھیں۔ لیکن یہ نیا دیس اپنا دیس تھا اپنا وطن اور اپنے وطن میں آج اپنا راج تھا۔ اپنا راج جس میں انگریز کی غلامی کی ذلت نہ تھی۔ جس میں مساوات، سکون، اطمینان، عدل وانصاف اور خوشحالی کی ضمانت کا خواب دیکھا گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آج بھی قافلے پہلے کی طرح بھٹکے ہوئے اور آج بھی راہی حیران ہیں۔ آج بھی افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت کے طوق ایک آزاد ملک کے آزاد فرزندوں کی گردنیں اپنے بوجھ سے جھکا رہے ہیں عدل وانصاف کے الفاظ آج بھی شرمندۂ معنی نہیں، یقیناً یہ وہ منزل نہیں جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ وہ منزل ابھی دور ہے۔ یہ وہ صبح نہیں جس کا انتظار تھا۔ وہ صبح ابھی دور ہے لیکن افق کی تاریکی میں دور سے کچھ کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں اور قافلہ اس طرف رواں ہے۔ [۲]

جب آزادی اپنے بھیانک روپ میں ہمارے سامنے آئی تو تمام ہندو پاک کے شاعروں نے اپنے جذبات کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا چونکہ شاعر سماج کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ احساس کے کرب سے گزر کر اپنے جذبات وخیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر اُتار دیتا ہے۔ شاعر ہندو پاک کا باشندہ ہو یا دنیا کے کسی بھی کونے کا رہنے والا ہو وہ جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی ظلم وستم، جنگ وجدل اور قتل وخون ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ غیر جانبدارانہ رویہ اپناتے ہوئے نہ صرف خون کے آنسو روتا ہے بلکہ ظلم وستم اور ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتا ہے۔ آزادی کے بدلے میں ملنے والی تباہ وبربادی قتل وغارت گری سے متعلق اشعار بیرونِ پنجاب کے شعراء کی غزلوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

لتھڑی ہوئی ہے خون میں آزادیِ وطن
اچھے رہے وہ لوگ جو زنداں میں رہ گئے

جوشؔ ملیح آبادی

کوئی گلوں پہ آنکھ نہ ڈالے
شاخیں ہیں تلوار سنبھالے

(شاعرؔ لکھنوی)

کئی لاکھ پھولوں نے پیرہن سرِ باغ ہنس کے اُڑا دیے
زہے فصلِ گل وہ ہوا چلی کہ چمن کی لے اُڑی آبرو

(فراقؔ)

آنکھوں سے ان کی اکثر آنسو نکل گئے ہیں
کیا کیا بھرے گلستاں ساون میں جل گئے ہیں

(مظفرؔ شمیم)

فضا بے کیف سی ماحول بیگانہ سا لگتا ہے
ہوا کیسی چلی نقشہ بدل ڈالا گلستاں کا

(باقر رضوی)

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

(ناصر کاظمی)

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جمالئے ہیں ڈیرے

(ناصر کاظمی)

اب کے ایسی پت جھڑ آئی، سوکھ گئی ہے ڈالی ڈالی
ایسے ڈھنگ سے کوئی پودا، کب پوشاک بدلتا ہے

(خلیل الرحمن اعظمی)

ہر گام پہ کچھ مسلے ہوئے پھول ملے ہیں
ایسے تو مرے دوست گلستاں نہیں ہوتے

(احمد فراز)

کہیں اُجڑی اُجڑی سی منزلیں، کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام ودر
یہ وہی دیار ہے دوستو، جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

(ناصر کاظمی)

آزادی کے بعد جو کربناک اور دردناک صورتِ حال پیدا ہوئی اُس کو پنجاب کی غزلیہ شاعری میں بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے چونکہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پنجاب کو زیادہ اور صحیح معنوں میں تقسیم کے کرب سے گذرنا پڑا تھا اس لیے پنجاب کی غزلیہ شاعری میں اس درد و کرب کا اظہار بڑی شدّت سے ہوا ہے۔

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا
نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا

(جگن ناتھ آزاد)

دورِ خزاں ہے سوکھ کے کانٹا ہوئے ہیں پھول
اِک خارزارِ صحنِ گلستاں ہے آج کل

(جوشؔ ملسیانی)

کتنی شمعیں جلیں گی اس کے لیے
ختم کب ہوگی غم کی رات نہ پوچھو

(جگن ناتھ آزاد)

ترتیبِ نشیمن کیا ہوگی، آئینِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

(جگن ناتھ آزاد)

دھوپ نے ٹہنیاں جُھلس ڈالیں
اب کہاں کوئی سایہ دار درخت

(اخترؔ ہوشیارپوری)

ایک اور عمر دے کہ تجھے یاد کر سکیں
یہ زندگی تو نذرِ خرابات ہوگئی

(کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ)

کیا ہے خون لاکھوں بے گناہوں کو مگر پھر بھی
اہنسا برہمن کی شیخ کا ایمان باقی ہے

(تلوک چند محرومؔ)

نظریں بھی انقلاب کے زیرِ اثر ہیں جوشؔ
تاریکیوں کا نام چراغاں ہے آج کل

(جوشؔ ملیسانی)

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

(ساؔحر لدھیانوی)

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

(ساؔحر لدھیانوی)

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گل سے چراغِ دیدہ و دِل

(حفیظؔ ہوشیار پوری)

خزاں زدہ وادیوں پہ ہر سمت موت منڈلا رہی ہے ابتک
مگر یہ ارشاد ہے کہ اس کو بہار کہہ کر فریب کھائیں

(ضیاؔ جالندھری)

بے چین و بے قرار و پریشاں ہے زندگی
اس پر بھی نغمہ ریز غزلخواں ہے زندگی

(جگن ناتھ آزادؔ)

آزادی سے پہلے اور فوراً بعد کا دور نظم کے عروج کا زمانہ ہے یہ وہ زمانہ ہے جب ترقی پسند ادبی تحریک کا جادو ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس تحریک نے ہر چھوٹے بڑے شاعر و ادیب کو اپنا قائل کرلیا تھا۔ اِسی زمانے میں غزل کی سب سے زیادہ مخالفت کی گئی اور انہی ہنگامی حالات میں اظہار و بیان

کے لیے غزل کو ناکافی سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ شہنشاہِ متغزلیں جگر مرادآبادی جیسا شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

حالی سے لیکر اب تک جتنی تنقید اُردو غزل پر ہوئی ہے شاید ہی کسی دوسری صنفِ ادب پر ہوئی ہو بقول ابواللیث صدیقی:

''حالی کے عہد سے اُردو غزل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اُٹھا اور اگرچہ حالی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھا لیکن شاعر و نقاد یہ سمجھے کہ حالی نے دِل زندہ کی کہانی جس دم ختم کی سب کے دلوں کی دھڑکنیں اسی دِن بند ہو گئیں۔ عشق و محبت کے سوتے سوکھ گئے، حسن اور جوانی ابدی خزاں سے ہمکنار ہو گئے اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا۔ شاعر کا کام بیواؤں کی شادی کرانا یتیم خانوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کسی کانفرنس کے آغاز یا انجام پر اناؤنسر کا فرض ادا کرنا رہ گیا۔ یہ سب نہایت مبارک افعال ہیں۔ لیکن ان پر شاعری کی تہمت کیوں رکھئے۔ بہر حال حالی سے اقبال تک غزل پر ایک آزمائش کا دور گذر گیا۔ غرض حالی کی کڑی تنقیدی اور کلیم الدین احمد کی مایوسی کے باوجود اردو غزل زندہ ہے اور اس میں زندہ رہنے کے آثار ہیں۔ شدید قسم کی داخلیت اور رمزیت کے باوجود غزل کی ہمہ گیری کا مقابلہ آج بھی کوئی دوسری صنفِ سخن نہیں کر سکتی۔ بہر حال اُردو غزل پر آزمائش کا ایک دور گذر گیا جس میں اس کی سخت جانی کا پوری طرح امتحان ہو چکا اور اس کے بعد غزل کا شعلہ بجھنے کی بجائے کچھ اور زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق زندگی کی اُن حقیقتوں سے ہے جو لازوال ہیں اور اس کا اندازِ بیان ایسی وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے جو ابدیت سے ہمکنار ہے''[۳]

غزل کسی ایک خیال کے پھیلاؤ کا نام نہیں جیسا کہ عام طور پر نظم میں دیکھنے کو ملتا ہے ہر چند کہ اقبالؔ نے بہت سی مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور ترقی پسند دور میں بھی بہت سی ایسی غزلیں لکھی گئیں ہیں جو کسی خاص موڈ کی پیداوار ہیں لیکن غزل کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ مختلف الخیال اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے فراقؔ گورکھپوری نے بجا طور پر اِسے انتہاؤں کا سلسلہ (Seris of Climax) کہا ہے اِس دور کی بہت سی غزلیں ایسی بھی ہیں جن پر باقاعدہ طور پر نظم کی طرح عنوانات دیے گئے ہیں ایسی غزلوں کو ہم غزل کی فارم میں بیانیہ نظم کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس غزل میں رمزواشاریت بہت ضروری ہے۔ دیگر خصوصیات سے قطع نظر غزل میں ایجاز واختصار سے کام لیا جاتا ہے اور صنائع بدائع اس کے حسن کو بڑھاتے ہیں۔غزل کی اِن خصوصیات ہی نے غزل کو ہر دور میں زندہ رکھا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد کا زمانہ نظم کے عروج کا زمانہ تھا لیکن اس سخت اور مشکل دور میں بھی غزل اپنی احیاء کے لیے برابر سرگرمِ عمل رہی ہے۔ آزادی کے بعد پنجاب کے بہت سے شعراء نظمیں لکھ رہے تھے اور آزادی کے بعد کے حالات کو نظم کے حوالے سے عوام تک پہنچا رہے تھے وہیں پنجاب کے شعراء کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جو نظم کے ساتھ ساتھ غزل کی روایت کو بھی زندہ رکھے ہوئے تھے اور اپنے دور کے ہنگامی حالات اور عصری مسائل کو غزل کے حوالے سے پیش کر رہے تھے مثلاً: جوشؔ ملسیانی، میلارام وفاؔ، اوڈے سنگھ شائقؔ، ساحرؔ لدھیانوی، جگن ناتھ آزادؔ، قیسؔ جالندھری، نسیمؔ نورمحلی، ہمؔا برنالوی، ساحرؔ کپورتھلوی، پریتم ضیائیؔ، دیس راج سوہل منکرؔ، رتنؔ پنڈوروی، ہری چند اخترؔ، بسملؔ کپورتھلوی، امرت لال عشرتؔ، کرپال سنگھ بیدارؔ، ساحرؔ سیالکوٹی، ساحرؔ ہوشیارپوری، کمالؔ کرتارپوری، دردؔ نکودری، کالی داس گپتا رضاؔ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، عرشؔ ملسیانی، نریش کمار شادؔ، پورن سنگھ ہنرؔ، رشیؔ پٹیالوی، نوبہار صابرؔ، شباب للت، زارؔ علامی، گوپال متلؔ، منظور حسن نافی کمالؔ مالیرکوٹلوی، سورج تنورؔ، پریتم وار برٹنی، ساغرؔ شفائی، مہر گیرا، نظیرؔ لدھیانوی، ابنِ انشاء، شِو دیال سحابؔ، بعد کی نسل میں جن شعراء نے غزل کی آبیاری کی اُن میں راجندر ناتھ رہبرؔ، آر۔ڈی۔ شرما تاثیرؔ، امرتپال سنگھ شیداؔ، رمیشؔ کھوسلہ، جوالا پرشاد، رام رتن مضطرؔ، مہر چند کوثرؔ،

مہیش پٹیالوی، ستنام سنگھ خمار، صابر ابوہری، سہیل اعظمی، پرکاش ناتھ پرویز، راج کنول، بلراج کومل، مہندر پرتاپ چاند، گوپال کرشن شفق، پریم پال اشک، کنول ہوشیار پوری، کرشن ادیب تخت سنگھ، خمار جالندھری، ارمان شہابی، آزاد گلاٹی، پریم کمار نظر، شرون کمار ورما، ڈاکٹر نریش، سرسوتی سرن کیف، گوردیال سنگھ بھاٹیہ عارف، باوا کرشن گوپال مغموم، کشمیری لال ذاکر، بمل کرشن اشک، سردار پنچھی، پروین کمار اشک، کرشن کمار طور، جگر جالندھری، متر نکودری، کرشن پرویز، عزیز پریہار، جسونت سنگھ راز، اجیت سنگھ حسرت، وید دیوانہ، کرشن موہن، خالد کفایت، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، اسلم حبیب، مشتاق وارثی محمود عالم، انوار آذر، انجم قادری، سدرشن کنول، رمضان سعید، ڈاکٹر ناشر نقوی، ڈاکٹر سلطان انجم اور ڈاکٹر محمد رفیع کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مذکورہ بالا فہرست میں پنجاب کے کچھ اہم غزل گو شعراء کے نام غیر دانستہ طور پر شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔ لیکن یہاں رقم السطور کا مقصد نام گنوانا یا شعراء کے حفظِ مراتب کا خیال رکھنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ پنجاب کے شعراء نے آزادی کے بعد نا مساعد حالات میں بھی غزل کی روایت کو زندہ رکھا اور غزل میں نئی نئی گنجائشیں پیدا کیں۔ آزادی کے بعد کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ پنجاب کی اُردو غزل ہندوستان میں کہی جانے والی اردو غزل سے کسی بھی لحاظ سے پیچھے نہیں ہے۔

پنجاب کے اردو شاعروں نے نہ صرف حب الوطنی کے گیت گائے بلکہ اپنے ہم سائے ملکوں سے بھی پیار و محبت کے جذبات سے پیش آئے ہیں اور ملک میں پیدا ہونے والے ہر طرح کے اقتصادی اور سماجی انقلابات کو بھی خوش آمدید کہا ہے انہوں نے ہر تازہ اور روح پرور ہواؤں کے لیے اپنے ذہن و دل کے دروازوں کو وا رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

چاہتا ہے عدو کو بھی دل سے
دوسرا کون اس کا ثانی ہے

(پورن سنگھ ہنر)

ملک میں ہر سو نظر آتا ہے سبز انقلاب
یہ کرشمہ بر ملا ہے باہمی امداد کا

(میلا رام وفاؔ)

افلاس کا علاج ہے امداد باہمی
درمانِ احتیاج ہے امداد باہمی

(میلا رام وفاؔ)

اصلیت یہ ہے یہاں قلّت کسی شے کی نہیں
اصلیت میں وجہء قلّت کثرتِ اولاد ہے

(میلا رام وفاؔ)

ملکی تقسیم کے بعد پنجاب میں خوف و ہراس اور بے یقینی کی جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس کے بارے میں پروفیسر آزاد گلاٹی لکھتے ہیں کہ:

"گذستہ چند برسوں سے پنجاب بے یقینی اور ہراس کے جس ماحول میں سانس لے رہا ہے۔اس کا دردمندانہ اظہار بھی یہاں کے شعراء کی وطن پرستی کا ثبوت ہے" [۴۲]

قتل اتنے ہو گئے ہیں جن کا اندازہ نہیں
یہ ہماری لغزشوں ہی کا تو خمیازہ نہیں

(سُکھ دیو شرما رشکؔ)

کل کے معلوم کس کا نام بن جائے خبر
آج کے اخبار میں کوئی خبر تازہ نہیں

(سُکھ دیو شرما رشکؔ)

پھول سے کھلتے ہوئے بچّوں کے خوابوں میں ہے اب
جب بھی سونا ہر طرف جلتے ہوئے گھر دیکھنا

(آزاد گلاٹیؔ)

ہر ایک کے سینے میں احساس جگانا ہے
یہ دیس سلامت ہے تو ہم بھی سلامت ہیں

(آر۔ڈی۔شرما تاثیر)

ملکی تقسیم کے دوران ہمارے بہت سے شعراء کو ہجرتوں کے موسم بھی جھیلنے پڑے۔ اور شبخون کے ہولناک منظر بھی دیکھنے پڑے انہیں یقین تھا کہ جب وہ ہجرت کر کے نئے وطن میں جائیں گے تو بہار کا موسم اُن کا استقبال کرے گا۔وہاں ہر طرف امن و امان ہوگا اور خوش حالی ہی خوشحالی ہوگی۔لیکن اُن کا یہ خواب ایک وہم ثابت ہوا۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے لفظوں میں:

''کتنے ہیں جو سفر کے اِرادے سے ہجرت کے سیلاب اور منزل کی صعوبتوں کی تاب نہ لا سکے اور جو آ گئے وہ سمجھتے تھے کہ بس اب خُدا کی مملکت میں داخل ہو گئے۔اس مملکت میں انصاف ہوگا۔یہاں شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہوں گی،موتیوں اور جواہرات کے محل ہوں گے،حوریں اُن کے لیے آغوش کشادہ اور چشم براہ ہوں گی اور انہیں تصورات میں مگن آنے والے کفر کے گھر سے جس قدر دور ہوتے جاتے تھے اور جس قدر اُن کی منزل قریب آتی جاتی تھی وہ مسرت و انبساط کے جذبات میں ڈوبتے چلے جاتے تھے کہ بس ایک قدم اور، اور وہ اُس جنّتِ ارضی میں داخل ہو گئے۔خُدا کی مملکت میں جا پہنچے۔انھیں سرحد پر حوریں استقبال کے لیے نہ ملیں اس کی جگہ سرحدی پولیس اور کسٹم کے منکر نکیر اُن کی تواضع کے لیے موجود تھے۔انھیں شہد اور دودھ کی نہریں، موتیوں اور جواہرات کے محل بھی نظر نہ آئے۔ہاں صاف اور کشادہ سڑکیں، اُن پر تیرتی ہوئی موٹریں،اُن میں خوش پوش عورتیں اور مرد ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے اور وہ ہاتھ پھیلائے کھڑے رہے۔مہاجروں کے کیمپ فاقہ، بیماری، زندگی اور موت کی کشمکش غریب الوطنی کا احساس جو آج

بھی ان پر طاری ہے''۔۵

آزادی کے بعد اُردو غزل کے مزاج اور موضوعات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور ہندوستانی سماج نے سیاسی سطح پر جو کروٹیں بدلیں اُن کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا صحیح علم ہونا بہت ضروری ہے بقول قمر الحق :

''آزادی کے بعد کی اُردو غزل کا مزاج سمجھنے کے لیے ہمیں سیاسی تاریخ کے اوراق پلٹنے ہوں گے۔ سماجی اور معاشرتی زندگی میں جب بڑا انقلاب آتا ہے تو اس کے تحت شعروادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت میں سیاسی انقلاب آیا اور بھارت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے اس سانحے یا حادثے نے سماجی و معاشرتی زندگی کو بہت متاثر کیا اُردو شعروادب بھی اس زد میں آیا۔ ظاہر ہے غزل بھی اس سے خوب متاثر ہوئی۔ اس پر جو اثرات مرتب ہوئے اس پر بحث کرنے سے پہلے تقسیمِ ہند سے متعلق تاریخی پس منظر کو دیکھنا ہوگا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا لیکن ۱۴ اور ۱۵ اگست کی تاریخوں میں دو ملک بن گئے ان کے حدود کا تعین رڈکلپ ایوارڈ (Red Clip Award) کے تحت ہوا جس کے اپنے کچھ مضمرات تھے۔ بہر حال اس کے نتیجے میں ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں اور پنجاب کے ایک بڑے حصے کو لیکر پاکستان وجود میں آیا۔ ہندوستان کا باقی بڑا حصہ بھارت یا انڈین یونین بن گیا۔ اس تقسیم کا سب سے بڑا اثر پنجاب، بنگال، بہار، یوپی، دلّی، مہاراشٹر اور حیدر آباد کی آبادی پر پڑا۔ مشرقی پنجاب (جواب پنجاب ہریانہ اور ہماچل پردیش میں تقسیم ہو چکا ہے) اور مغربی پنجاب میں یہ اس وقت پاکستان کا بڑا حصہ تھا فسادات پھوٹ پڑے اور اس کا سلسلہ مغربی یوپی اور دہلی تک پھیل گیا۔ بعض دوسرے علاقے بھی اس کی زد میں آئے اس صورتِ حال کو قابو

میں کرنے کے لیے بالآخر یہ طے کیا گیا کہ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے درمیان کی مسلم آبادی اور سکھ آبادی تقسیم کر لی جائے اور وہ اس طرح کہ مشرقی پنجاب کے تمام مسلمان مغربی پنجاب بھیج دیئے جائیں۔ اور وہاں کے سکھ اور ہندو ادھر منتقل ہو جائیں۔ انہیں حالات کے نتیجے میں ہندستان آنے والے شرنارتھی کہلائے اور یہاں سے جانے والے مہاجر۔ جس قانون کے تحت ہندوستان اور پاکستان کو الگ الگ بنایا گیا اس قانون میں یہ لچک بھی رکھی گئی کہ ریاستیں چاہیں تو آزاد رہیں یا ہندوستان یا پاکستان میں مل جانے کا فیصلہ کر لیں۔ لیکن اس فیصلہ کے تحت جلد ہی ہندوستان کے متعدد علاقوں میں انتشار برپا ہونے لگا۔ یہ انتشار حیدر آباد، جونا گڑھ اور بالخصوص کشمیر میں زیادہ دیکھنے میں آیا۔ جونا گڑھ نے پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور کشمیر اور حیدر آباد نے یہ چاہا کہ وہ آزاد رہے'' [6]

''تقسیمِ ہند کے بعد نئے احساسات ابھرے ان میں وطن سے جدائی بیگانگی کا نیا ماحول قدروں کی ٹوٹ پھوٹ اور سماجی رشتوں کی شکست کا احساس زیادہ نمایاں تھا۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجرت بھی اور ہندوستان کی غیر محفوظ فضا میں رہنا بھی جنوں کے مترادف تھا۔ تقسیمِ ہند کی جو بنیادیں تھیں ان میں قوی ترین فرقہ وارانہ عصبیت نے ہندو اکثریت کے ملک میں مسلمانوں کے لیے خوف، انتشار اور بے اعتمادی کا ماحول بنا دیا تھا۔ ایسے کسی ماحول میں رہنا بالیقین جنون کے مترادف تھا۔ یہ جنون اپنی مٹی سے وابستگی کا جنون تھا۔ اس کی کشش سے متاثر ہونے کا جنون تھا۔ وہ زمین جس پر اس کے گھٹنوں کے نشان تھے وہ زمین جس کی مٹی اس نے بزرگوں کی آنکھ بچا کر چاٹی تھی۔ وہ زمین جس کے سینے پر لوٹا تھا وہ زمین جو اس کی محبوبہ تھی، جو اس کی معشوق تھی اس کو وہ کیسے چھوڑ دیتا'' [7]

جوئے خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں مطالعے کے بعد ہمیں پنجاب کی غزلیہ شاعری تقسیمِ ملک کے زخموں سے چور اور ہجرتوں کے درد سے بھری ہوئی ملتی ہے ایک ایسا درد جس کا کوئی علاج سوائے صبر نظر نہیں آتا۔

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

(ساحر لدھیانوی)

برسوں کا آج بھی ہے وہی باردوش پر
سنتے تھے ہم کہ طوق غلامی کے کٹ گئے

(حافظ لدھیانوی)

اے جوشؔ کیا غرض مجھے حور و قصور سے
میرا وطن مرے لیے جنّت سے کم نہیں

(جوشؔ ملسیانی)

کوئی خبر نہ آئی دلِ بدنصیب کی
مقتولِ غم ہوا کہ شہیدِ ادا ہوا

(اخترؔ ہوشیار پوری)

آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر
جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

(جگن ناتھ آزادؔ)

اب ہیں سرگرمِ تلاش منزلِ جانانہ ہم
چھوڑ آئے ہیں حدودِ کعبہ وبُت خانہ ہم

(جگن ناتھ آزادؔ)

شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا
خبر نہیں کہ دلِ شیشہ گر یہ کیا گذری

(جگن ناتھ آزاد)

اہلِ دل حالات کی رفتار سے لاچار ہیں
دوست ننگِ دوستی ہیں آشنا اغیار ہیں

(اشک امرتسری)

وحشت کا ننگا ناچ ہی باقی بچا مہیشؔ
انسانیت تو جل گئی نفرت کی آگ میں

(مہیشؔ پٹیالوی)

جماعتیں ، یہ مذاہب ، یہ آپسی جھگڑے
تمام تنگ نظر کا ، فتور لگتے ہیں

(مہیشؔ پٹیالوی)

بڑھے گی تیرگی نورِ سحر سے ہم نہ کہتے تھے
رہے گا دور اُجالا بام و در سے ہم نہ کہتے تھے

(طالبؔ شملوی)

اور تو اور یہ رہزن بھی گلہ کرتے ہیں
کر گئے راہ نما بے سروساماں ہم کو

(طالبؔ شملوی)

رہبرو ! ہوگا تمہارے پاس کچھ اس کا جواب
آج ہم اپنے وطن میں ہی مہاجر کیوں ہوئے

(شبابؔ للت)

خود ہی تم سمجھ لو گے نورِ اُفق کیا شے ہے
ایک شب جو دشت کے سائے میں گذارو گے

(شبابؔ للت)

قافلے کے ہم سفر وہ اب بھی آجاتے ہیں یاد
ہجرتوں کی رُت میں جو مارے گئے شبخون میں

(شبابؔ للت)

ہم سفر بن کے ہم چلے دونوں
راستے ہو گئے جدا کیوں کر

(شبابؔ للت)

امید تو تھی اس سے پُر نور سویرے کی
سورج نے مگر بانٹی خیرات اندھیرے کی

(شبابؔ للت)

اے وطن تیری جبیں پر تھا غلامی کا جو داغ
ہم کو وہ داغِ ندامت خون سے دھونا پڑا

(شبابؔ للت)

جس میں بہتے تھے کبھی پیار کے پانچوں دریا
آج بہتے ہیں وہاں خون کے دھارے کتنے

(گوپال کرشن شفقؔ)

کیا ہوا مذہبی تفریق کا حاصل دیکھیں
آپ کے کتنے مرے اور ہمارے کتنے

(گوپال کرشن شفقؔ)

تم جس طرف چلے ہو گلشن مہک اُٹھے ہیں
ہم جس طرف بڑھے ہیں ویرانے بن گئے ہیں

(آزادؔ گلاٹی)

آزادؔ اہلِ فن کو یہ کیا فرار سوجھے
آرامِ زندگی سے بیگانے بن گئے ہیں

(آزادؔ گلاٹی)

رہبروں کی اِک خطا قوموں کو لے ڈوبی شبابؔ
کتنی دیواریں ذرا سی دیر میں در ہو گئیں

(شبابؔ للت)

پیار محبت کے جذبے کو دنیا میں بدنام کیا
بھائیوں نے ہی بھائیوں کا جب ایسا قتلِ عام کیا

(پنّوں پرواز)

ملک بانٹ کر ہندو پاک ہو گئے
پیار و دوستی کے خواب خاک ہو گئے

(پنّوں پرواز)

تقسیم کے اُس دور میں تھا کیسا قہر چھایا
پھیلے ہوئے تھے جابجا پھندے اجل اجل کے

(پنّوں پرواز)

آزادی کے بعد جہاں پنجاب کے غزل گو شعراء نے آزادی سے پیدا شدہ مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور عصری موضوعات کو غزل میں سمویا وہیں پنجاب کے بہت سے شعراء ایسے بھی تھے جو روایتی غزل کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور خالص غزل کہہ رہے تھے۔ یہ وہ شعراء تھے جن کا تعلق داغؔ اسکول سے تھا۔ پنجاب میں داغؔ اسکول

کے نمائندہ اور مُستند شاعر حضرتِ جوشؔ ملسیانی تھے۔ جنھوں نے داغؔ اسکول کی روایت کو پنجاب میں زندہ رکھا اور اپنے شاگردوں کو بھی داغ کی روایت کو سلیقے سے نبھانے کی تعلیم دی۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے بہت سے شعراء کے کلام میں داغؔ کے کلام کی سادگی، روانی، زبان کی صفائی، سلاست اور پرکاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ جوشؔ اسکول کے نمائندہ شاعر، تسیمؔ نورمحلی، کمالؔ کرتارپوری، ساحرؔ سیالکوٹی، ساحرؔ ہوشیارپوری، قیسؔ جالندھری، دردؔ نکودری، بسملؔ کپورتھلوی، کالی داس گپتا رضاؔ، ہماؔ ہرنالوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، امرت لال عشرتؔ، عرشؔ ملسیانی، نریش کمار شادؔ، پورن سنگھ ہنرؔ، شبابؔ للت، رشی پٹیالوی، مترؔ نکودری، جگرؔ جالندھری وغیرہ ہیں۔ اِن شعراء نے داغؔ اسکول کی فنّی پابندیوں کا پورا احترام رکھا ہے اور پنجاب میں داغؔ اسکول کی روایت کو مزید استحکام عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جن شعراء نے حضرتِ جوشؔ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے اور اپنے قابل استاد اور مستند شاعر کی رہنمائی میں غزل کا فن سیکھا ہے وہ بھی غزل کے فن پر اُستادانہ دسترس رکھتے ہیں بقول ساحرؔ سیالکوٹی ''جنابِ جوشؔ کے شاگرد بھی اُستاد ہوتے ہیں'' بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جوشؔ کے بعد میلا رام وفاؔ پنجاب کے استاد شاعر ہیں جنھوں نے پنجاب میں کلاسیکی غزل کی روایت کو زندہ رکھا اور اپنے شاگردوں کو بھی کلاسیکی غزل کی روایت پر کاربند رکھا۔ وفاؔ کے شاگردوں میں پریتمؔ ضیائی، شِو دیال سحابؔ، باوا کرشن گوپال مغمومؔ، رام رتن مضطرؔ، جوالا پرشاد شاہیؔ، کنولؔ میرٹھی، رمیش کھوسلہ امیدؔ مشہور و معروف شاعر ہیں رتنؔ پنڈوروی بھی پنجاب کے اُستاد شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی کلاسیکی غزل کا پورا احترام ملتا ہے۔ ان کے شاگردوں میں راجندر ناتھ رہبرؔ اور سریش چندر شوقؔ جیسے معروف شاعر ہیں۔ اُردو شاعری میں استادی شاگردی کی روایت شروع ہی سے رہی ہے۔ اس مقدس رشتے کو مستحسن نظروں سے دیکھا جاتا تھا لیکن اب اس رشتے میں پہلے جیسا خلوص اور احترام نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ روایت کمزور ہو چلی ہے لیکن پنجاب کے شعراء نے اُستادی شاگردی کے رشتے کا احترام کرتے ہوئے اس

روایت کو آگے بڑھایا ہے اور آج بھی پنجاب میں اُن اساتذہ ٔفن کا وجود غنیمت ہے جن کی سرپرستی میں نوجوان نسل شاعری کا فن سیکھ رہی ہے۔ رتن پنڈوروی کے بعد کمال مالیرکوٹلوی کا شمار بھی اُستاد شعراء میں ہوتا ہے ان کے شاگردوں میں پریم وار برٹنی، ڈاکٹر نریش اور سدرش کنول کے نام شامل ہیں۔ پٹیالہ میں اُردو غزل کی آبیاری کرنے والوں میں نو بہار صابر کا نام اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے آزادی کے بعد پٹیالہ جیسے شہر میں اُردو غزل کی آبیاری کی۔ غزل کے اس چراغ نے جن چراغوں کو روشنی بخشی اُن میں مہر چند کوثر، ساغر شفائی، مہیش پٹیالوی، خالد کفایت، سرسوتی سرن کیف، صابر ابوہری، سہیل اعظمی، پرکاش ناتھ پرویز، راج کنول، ہمت رائے شرما اور جوہر بھارتی قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب کے وہ شاعر جو آزادی سے پہلے یا بعد بسلسلہ ٔروزگار یا دیگر وجوہات کی بنا پر پنجاب سے باہر رہے اُن میں تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، ہری چند اختر، بلراج کومل، بانی، کمار پاسی، کرشن موہن، گوپال متل، کرشن کمار طور، ارمان شہابی، مہندر پرتاپ چاند اور پریم پال اشک کے نام نامی شامل ہیں۔ مذکورہ بالا شعراء میں بعض شعراء ہمیشہ پنجاب سے باہر رہے اور بعض ایسے ہیں جو کبھی کبھی پنجاب سے باہر رہے۔ کلاسیکی غزل اور داغ اسکول کے سلسلے میں یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ اہلِ پنجاب نے داغ کی فکر کو نہیں، فن کو اپنایا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب کے شعراء ذہنی عیاشی کے سخت خلاف ہیں اور وہ زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی اخلاقی قدروں کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کا واضح ثبوت عُریانیت اور بھکڑپن سے مبّرا اُن کی شاعری ہے۔ ہر چند کہ بعض شعراء کے ہاں داغ کا فکری اسلوب بھی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اس کا اطلاق پنجاب کی مجموعی شاعری پر نہیں کیا جاسکتا۔

ادائے ناز ہی کے مختلف یہ دو کرشمے ہیں
تیرا دل میں اُتر جانا میرا دل سے اُتر جانا

(جوش ملسیانی)

بے سود ارادہ مقتل کا بے کار دُعا مرجانے کی
موت اپنے وقت پر آئے گی بے وقت نہیں وہ آنے کی

(جوشؔ ملسیانی)

بھولی صورت ہی کو دل دے کے ہوئے ہم برباد
نہ مزاج آپ کا دیکھا نہ طبیعت دیکھی

(جوشؔ ملسیانی)

بزم ہی میں نہیں دل میں بھی جگہ دو صاحب
یہ دِکھاوے کی محبت ہمیں منظور نہیں

(جوشؔ ملسیانی)

عشق تو جانتا ہے رُتبۂ حُسن
حُسن بھی عشق کا رُتبا جانے

(جوشؔ ملسیانی)

داغِ دل سے روشنی نہ ملی
یہ دیا بھی جلا کے دیکھ لیا

(عرشؔ ملسیانی)

خُم میں نہ صُراحی میں نہ ساغر میں ہے بسملؔ
جو اُن کی نگاہوں میں مئے ہوش رُبا ہے

(بسملؔ کپورتھلوی)

یادِ جمالِ دوست کی رعنائیاں نہ پوچھ
گویا گذر رہے ہیں کِسی گلستاں سے ہم

(بسملؔ کپورتھلوی)

وہ اور ہونگے پی کے جو سرشار ہوگئے
ہر جام سے ہمیں تو نئی تشنگی ملی

(ساحرؔ ہوشیار پوری)

لو ساحرؔ دل ٹوٹ گیا
سارے عقدے ہوگئے حل

(ساحرؔ ہوشیارپوری)

نگاہِ عشق اٹھے کیا آب و تابِ حسنِ ظاہر پر
یہ کشتی جس جگہ گہرا نہ ہو پانی نہیں جاتی

(قیسؔ جالندھری)

نظر اُن کی، زباں اُن کی، تعجب ہے کہ اس پر بھی
نظر کچھ اور کہتی ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے

(ساحرؔ ہوشیارپوری)

دُنیا نے دِکھائے نہ مقدر نے دِکھائے
جو رنگ تری چشمِ فسوں گر نے دِکھائے

(ساحرؔ ہوشیارپوری)

میں جو توبہ کروں گناہوں سے
سب کہیں گے گناہ گار مجھے

(ساحرؔ ہوشیارپوری)

ملتے ہی دو دلوں کے جو نظریں اٹھیں رضاؔ
دیکھا تو پھر حجاب کوئی درمیاں نہ تھا

(کالی داس گپتا رضاؔ)

میری نگاہِ شوق کی اے حُسن داد دے
حق جس نے کردیا ہے ادا انتخاب کا

(کالی داس گپتا رضاؔ)

جس میں نظر جوان تھی، ہر شے حسین تھی
یارب کہاں گیا وہ زمانہ شباب کا

(کالی داس گپتا رضاؔ)

انداز یہ کہتا ہے ترے لطف و کرم کا
پہلے بھی کبھی تجھ سے ملاقات ہوئی ہے

(پورن سنگھ ہنرؔ)

نام سنتے تھے جس قیامت کا
وہ تمہارا شباب ہو کے رہی

(پورن سنگھ ہنرؔ)

یوں میری مشتاق آنکھوں میں سما جاتے ہیں آپ
آئینہ بھی دیکھتا ہوں تو نظر آتے ہیں آپ

(پورن سنگھ ہنرؔ)

ہنرؔ خلوصِ محبت نے کی تو ہے تاثیر
وہ دِل ہی دل میں پشیماں ہے دیکھئے کیا ہو

(پورن سنگھ ہنرؔ)

وہ آئے ہنرؔ مجھ تک یوں تھامے ہوئے دِل کو
جیسے کوئی دیوانہ دیوانے تک آپہنچے

(پورن سنگھ ہنرؔ)

غمِ امروز، یادِ عیش ماضی، فکرِ آئندہ
پریشانی کی صورت یوں بھی ہے، یوں بھی ہے، یوں بھی ہے

(نسیم نورمحلی)

حسنِ ادا کی ہوتی ہے تعریف اے نسیمؔ
معنی یہ غور کچھ بھی نہیں، یہ تو کچھ نہیں

(نسیم نورمحلی)

آنکھیں مری گنگ وجمن ایک اِس طرف ایک اُس طرف
دریا ہیں یہ دوموجزن ایک اس طرف ایک اُس طرف

(نسیم نورمحلی)

الفت میں لاگو جان کے دونوں میں قُرب وہجرِ دوست
ناگن اک اسکے دو ہیں پھن ایک اِس طرف ایک اُس طرف

(نسیم نورمحلی)

جگر نے زخم، دل نے داغ، سر نے دردِ سر پایا
تمہارے عشق سے ہم باز آئے، ہم نے بھر پایا

(نسیم نورمحلی)

دل کی بستی عجیب بستی ہے
روز اُجڑتی ہے روز بستی ہے

(کنول ہوشیار پوری)

عجیب عالم ہے آج دل کا، نہ غم کی صورت نہ ڈھب خوشی کا
اُلجھ گیا کن معاملوں میں، معاملہ میری زندگی کا

(اخگر پانی پتی)

جس سے آفت کی شروعات ہوا کرتی ہے
حاصل عشق و ہی بات ہوا کرتی ہے

(ذوقی لدھیانوی)

تم تصور میں بھی آتے ہوئے گھبراتے ہو
کبھی ایسے بھی ملاقات ہوا کرتی ہے

(ذوقی لدھیانوی)

عشق میں جی کا زیاں معلوم ہے
لذّتِ سوزِ نہاں معلوم ہے

(صابرابوہری)

مری کوتاہ بخشی نے یہ عالم مجھ کو بخشا ہے
ندیم اب تک کمی میں بھی نہیں پائی کمی میں نے

(ندیم نورمحلی)

کیا خبر تھی جب کبھی ہوگا تمہارا سامنا
ایک دیوارِ تحیر درمیاں ہوجائے گی

(رشی پٹیالوی)

تیری یادوں کے دیئے ہو جائیں گے روشن وہاں
رات ہم اختر شماروں کو جہاں ہوجائے گی

(رشی پٹیالوی)

نہ میرے ذوقِ نظر کو دیکھے نہ حاصلِ انتخاب مانگے
مزا تو جب ہے زمانہ اک دن تجھی سے تیرا جواب مانگے

(مہر چند کوثرؔ)

تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا

(میلا رام وفاؔ)

ارادے باندھتا ہوں ، سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہوجائے، کہیں ایسا نہ ہوجائے

(حفیظؔ جالندھری)

میری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لیے مجبور ہوں میں

(حفیظؔ جالندھری)

کوئی سوتا ہے جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دنیا کی راحت بھی

(تلوک چند محرومؔ)

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

(ہری چند اخترؔ)

زندگی بیٹھی تھی اپنے حسن پر بھولی ہوئی
موت نے آتے ہی سارا رنگ پھیکا کر دیا

(ہری چند اختر)

بے خودی میں کوئی آواز تو سُنتا ہوں ضرور
دیکھتا ہوں تو کوئی صاحب آواز نہیں

(اوُدے سنگھ شائق)

نت نیا سوگ ہے ہر روز نیا مرنا ہے
دل نے نقصان اٹھایا ہے مرادل ہوکر

(اوُدے سنگھ شائق)

اشک ہوں کچھ مری اوقات نہیں لیکن
اُس کی آنکھوں سے نکلتا تو مزا آجاتا

(پورن سنگھ ہنر)

کر دیا دل ٹکڑے ٹکڑے، اب کیا ٹکڑے چُنتے ہو
یہ شیشہ ہے آئینہ ہے، میں نے تمھیں کہا تھا نا

(کنول ہوشیار پوری)

کانٹوں سے میں نے پیار کیا ہے کبھی کبھی
پھولوں کو شرمسار کیا ہے کبھی کبھی

(نریش کمار شاد)

میں پھول چُننے آیا تھا باغِ حیات میں
دامن کو خارزار میں الجھا کے رہ گیا

(نریش کمار شاد)

تیرگی کے بغیر اے ساحر
روشنی روشنی نہیں ہوتی

(ساحر سنامی)

تسلی دے گئے اُس کو جسے دُشوار تھا جینا
غرض یہ تھی کہ مرنا بھی اُسے دُشوار ہو جائے

(ہماؔ ہرنالوی)

لب اُن کے بے قرار تبسّم ہیں اس طرح
کھلنے کو ہو کلی کوئی جیسے گلاب کی

(عاجزؔ جالندھری)

تیرے کرم کی مجھ کو شکایت ہے اس لیے
تیرا کرم فریب کرم ہے ، کرم نہیں

(عاجزؔ جالندھری)

تیرا جانا بھی کیا قیامت ہے
تو گیا ، دل گیا ، قرار گیا

(عاجزؔ جالندھری)

وفاؔ دل لگا کر کسی بے وفا سے
کبھی چین پایا ، نہ آرام پایا

(وفاؔ سیال پٹیالوی)

عشق پر لازم نہیں پابندیء رسم و رواج
اور ہے قانون اس کا اور ہے اس کی کتاب

(وفاؔ سیال پٹیالوی)

پہلے بھی آپ کب مجھے ملتے تھے شوق سے
پہلو تہی کا اب بھی مجھے کچھ گلا نہیں

(وفاؔ سیال پٹیالوی)

تم اگر چاند کی مانند نہ پیارے ہوتے
رات بھر میں نے یونہی چاند نہ دیکھا ہوتا

(صابرؔ ہوشیار پوری)

ہوتا ہے ستم اور تو ملتا ہے مزا اور
اے دوست ستا اور ستا اور ستا اور

(نامی نادری)

روز بھر بھر کے یہ اُبھرتے ہیں
زخمِ دل بھی کمال کرتے ہیں

(نامی نادری)

کسی کو زندگی دی زندگی نے
کسی کو زندگی نے مار ڈالا

(نامی نادری)

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

(قیس جالندھری)

قاصد نے اور کردیا برہم مزاجِ یار
کیا کیا نہ جانے جاکے اِدھر کی اُدھر کہیں

(سکھ دیو شرما رشک)

ہم کسی اور کو تکتے ہی نہیں ہیں ورنہ
اِک نظر دیکھ لیں جس کو وہ حسیں ہو جائے

(سکھ دیو شرما رشک)

آئینہ دیکھئے مگر اتنا رہے خیال
خود لگ نہ جائے آپ کو اپنی نظر کہیں

(سکھ دیو شرما رشک)

عکس اُتار لیتے ہیں روح میں بہاروں کا
ہم کبھی کبھی یوں بھی دل کی رُت بدلتے ہیں

(تخت سنگھ)

خرد کی بات اس سے کوئی بھی مانی نہیں جاتی
نہیں جاتی دلِ ناداں کی ناداں نہیں جاتی

(آر۔ڈی۔شرما تاثیر)

جانا پہچانا ہوا منظر نظر آنے لگا
پھر وہی کوچہ وہ گھر وہ در نظر آنے لگا

(مہر گیرا)

دور ہو کر اور بھی کچھ ہوگیا میرے قریب
وہ بچھڑ کر بھی مجھے اکثر نظر آنے لگا

(مہر گیرا)

حسرتوں کا ہوگیا ہے اس قدر دِل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

(جگر جالندھری)

سُننی ہی پڑے گی، تمہیں سُننی ہی پڑے گی
آوازِ محبت ہے یہ آوازِ محبت

(جگر جالندھری)

مجھے کچھ کام کرنا ہے جہاں میں
جنوں کو عام کرنا ہے جہاں میں

(صابر ابوہری)

داد مل جائے مجھے اپنی پریشانی کی
وہ بھی ہوجائیں پریشاں تو مزہ آجائے

(آزاد گورداسپوری)

چھڑکتے ہو نمک چٹکی سے، میری تو یہ خواہش ہے
اُلٹ دو میرے زخموں پر نمکداں، دیکھتے کیا ہو

(آزاد گورداسپوری)

ایک ہی حال یہ رہتی ہے خزاں ہو کہ بہار
شاخِ امید کبھی پھولتی پھلتی ہی نہیں

(آزاد گورداسپوری)

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر

(گوپال متل)

عشق نے واقعی اعجاز دِکھا رکھا ہے
دل سے وحشی کو بھی رستے پہ لگا رکھا ہے

(گوپال متل)

اُن پہ جب اپنا گماں ہو تو نکھرتا ہے شعور
خود پہ جب اُن کا گماں ہو تو غزل ہوتی ہے

(پرکاش ناتھ پرویز)

آنکھوں میں ہے بہارِ دو عالم بَسی ہوئی
ہم لوگ آج محفلِ جاناں سے آئے ہیں

(پرکاش ناتھ پرویز)

ہجومِ غم میں جو بہکے کہیں قدم میرے
ترے خیال کا دامن پکڑ لیا میں نے

(سردار پنچھی)

جب گردشِ حیات مزاجی دُکھا گئی
غم نے تمھارے آکے دلاسا دیا مجھے

(کمار پاشی)

روایتی غزل کے تعلق سے ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنے مضمون ''اُردو غزل آزادی کے بعد:
(ہندوستان میں) میں لکھا ہے کہ ''اُردو غزل اپنی روایت کی ہر منزل پر بعض

ایسے بے لوچ اور راسخ اصولوں کی پابند رہی ہے کہ زمانے کے تغیر وتبدل کا اثر اس پر بہت گہرا نہ ہو سکا اور کم وبیش ہر عہد کی غزل گوئی میں چند ایسے مشترک عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے جن کی تقسیم ماضی اور حال کے خانوں میں ممکن نہیں'' ۸؎

ڈاکٹر شمیم حنفی کی مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں آزادی کے بعد پنجاب کی مجموعی غزل کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں پنجاب میں عصری حالات اور تقاضوں کے زیرِ اثر ترقی پسند غزل اور جدید غزل لکھی جا رہی تھی وہیں کلاسیکی غزل بھی اپنی روایت کی توسیع کے لیے برابر سرگرم عمل تھی اور غزل کے وہ موضوعات جو غزل کی جان ہیں مثلاً حسن وعشق، گُل وبُلبل، ساقی و مے خانہ، راز و نیاز، حرف و حکایات، زلف ورخسار، واعظ و رند اور معاملاتِ نازک نئے اندازِ بیان اور نئے اسلوب میں ادا ہو رہے تھے یعنی نئی بوتل میں پرانی شراب انڈیلنے کا کام بھی بحسن وخوبی کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس دور کی روایتی غزل کا مثبت پہلو یہ رہا کہ اس دور میں اُردو غزل نے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب سے کافی حد تک اپنا دامن چھڑاتے ہوئے سہل پسندی کو اپنایا۔ کہیں کہیں اگر غمِ دوراں اور غمِ روزگار نے جھنجھلاہٹ والی کیفیت پیدا بھی کی ہے تب بھی پنجاب کے غزل گو شعراء نے تلخ کلامی سے کام نہیں لیا۔ غمِ دوراں کی بھٹّی میں تپ کر اُن کی شاعری کا کندن اور بھی نکھر گیا۔

آزادی کے بعد پنجاب کی غزلیہ شاعری میں بیک وقت کئی دھارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسند اُردو غزل، کلاسیکی غزل اور جدید اُردو غزل۔ سرسیّد کی علی گڑھ کی ادبی تحریک، انجمنِ پنجاب لاہور اور حلقۂ اربابِ ذوق سے قطع نظر مذکورہ بالا تینوں ادبی تحریکات ورجحانات پنجاب کی ادبی تاریخ میں اس لیے بھی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے آزادی کے بعد جہاں پنجاب کے شعروادب کو متاثر کیا ہے وہیں ان کے اثرات اُردو غزل پر بھی پڑے ہیں۔ اِن تینوں ادبی رجحانات وتحریکات کے بارے میں باب سوم میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اِن کا مختصر جائزہ لینا ہی مقصود ہے۔ ترقی پسند

تحریک کا آغاز آزادی سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور آزادی تک پہنچتے پہنچتے اس تحریک نے کافی شہرت اور طاقت حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کے شاعر و ادیب اس تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے اور اپنے اپنے فن کے ذریعے اس تحریک کی تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ ہندوستان کے جو مشہور و معروف قلم کار اس تحریک سے جڑے اُن میں، سجاد ظہیر، ملک راج آنند، علی سردار جعفری، مجروحؔ سلطان پوری، ساحرؔ لدھیانوی، احمد ندیمؔ قاسمی، فیض احمد فیضؔ، احسان دانش، غلام ربانی تاباںؔ، فارغ بخاری، اعجاز صدیقی، مجازؔ جذبیؔ، وامقؔ جونپوری، جوشؔ، مجنوںؔ گورکھپوری، کرشن چندر، جاں نثار اخترؔ، اخترؔ رائے پوری، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سلامؔ مچھلی شہری، مخدومؔ محی الدین وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ملک تقسیم ہوا تو یہ تحریک بھی دو حصّوں میں بٹ گئی اور ترقی پسندوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پاکستان چلی گئی ان میں بعض ترقی پسند ایسے تھے جنھوں نے پاکستان ہی میں رہنا پسند کیا۔ تقسیم کے بعد فیضؔ احمد فیضؔ، ندیمؔ احمد قاسمی اور احسان دانش جیسے شاعر پاکستان کے حصے میں آئے۔

ترقی پسندوں نے زندگی کا اصل مقصد 'روٹی' کو سمجھ لیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان کی زندگی 'روٹی' ہی کے گرد گردش کرتی ہے۔ اُن کے ہاں روحانی اقدار اور مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس تحریک کا آغاز تو ۱۹۱۷ء کے روس کے سیاسی انقلاب سے ہو چکا تھا۔ بدقسمتی سے اس تحریک سے وابستہ افراد نے زندگی اور روٹی سے جڑے تمام مسائل کا حل اشتراکیت کو سمجھ لیا تھا بقول عظیم الحق جنیدی:

> ''ترقی پسند شعراء اور مصنفین نے سیاسی انقلاب کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ جاگیرداری، سرمایہ داری، معاشی اور اقتصادی استحصال، بھوک، افلاس اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف جنگ کی جائے۔ انھوں نے اشتراکیت کو اس کا حل بتایا اور اسی کا پرچار کیا۔ حالانکہ یہ حل اس ملک کے ماحول اور تہذیبی

روایات کے خلاف تھا۔ یہ لوگ بغاوت کے علمبردار تھے۔ اس بغاوت میں وہ مذہب اور قدیم اخلاقی اقدار سے آزادی کا مطالبہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور افسانوں کے ذریعے ایک مزدور انقلاب کی بشارت دی''۹

اس تحریک کی شدّت پسندی ہی نے اس کو نقصان پہنچایا اور دھیرے دھیرے اس تحریک کا طلسم ختم ہوتا گیا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد یہ تحریک دم توڑ گئی تقسیم کے بعد پنجاب کے جن غزل گو شاعروں کے ہاں اس تحریک کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے اُن میں ساحؔر لدھیانوی، پریم وار برٹنی، ڈاکٹر سردار انجم، گوپال کرشن شفق، سردار پنچھی، شبابؔ للت، پروین کمار اشکؔ اور ڈاکٹر نریش کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں کہ صرف اِن شعراء کے ہاں ہی ترقی پسندی کا رجحان ملتا ہے سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کے ہر شاعر نے غیر شعوری طور پر اس تحریک کا اثر قبول کیا ہے۔

پنجاب کی غزلیہ شاعری میں غالب ترین رجحان جدیدیت کا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہر چند کہ جدیدیت کا اِطلاق ۱۹۶۰ء کے بعد کی شاعری پر ہوتا ہے لیکن تقسیمِ ملک کے بعد ہی سے جدیدیت کی شروعات ہو چکی تھی۔ دراصل ملکی تقسیم سے جو خوف و ہراس پیدا ہوا اور سائنسی اور مشینی معاشرے نے جس طرح انسانیت کے چہرے کو مسخ کیا اُس نے ہمارے شعراء کے اندر بے یقینی، گھٹن، تنہائی اور شکستِ ذات کے احساسات کو اُبھارا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری غزل خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر کرنے لگی۔ دوسرے یہ کہ جدیدیت نظریاتی طور پر ترقی پسندی کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ ٹکراؤ محض نظریہ ہی کا نہیں ہے بلکہ اُس توڑ پھوڑ کے خلاف بھی ہے جو ترقی پسندوں نے اصنافِ شاعری کی ہیئت اور اسلوب میں کی۔

ترقی پسندی اور جدیدیت کے بنیادی فرق کو واضح کرتے ہوئے اصغر علی انجینیر رقمطراز ہیں:

''دراصل جدیدیت اور ترقی پسند ادب میں بنیادی فرق نظریے اور ایتھوز

(Ethos) کا ہی ہے۔ جدیدیت زمان و مکان کی معروضی حقیقت کی بھی منکر ہے اور انسانی آزادی اور وقار کی بھی۔ جدیدیت انسان کو حالات کے جبر کا شکار تصور کرتی ہے اور اس بات کی قائل ہے کہ اس صورتِ حال کو ہرگز بدلا نہیں جا سکتا۔ تاریخ کی ابتدا سے انسان حالات کے جبر کا شکار رہا ہے اور رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں جدیدیت کا فلسفہ انسان کو مجبورِ محض تصور کرتا ہے اور اسی لیے جدیدیت کے نزدیک ادب محض انسان کے داخلی کرب کا اظہار ہے اور یہ کرب حالات کے جبر کا کرب ہے۔

اس صورتِ حال میں نہ ابلاغ کوئی معنی رکھتا ہے نہ آزادیٔ عمل۔ انسانی وقار بھی بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک اس کے برخلاف نہ انسان کو مجبورِ محض تصور کرتی ہے نہ معروضی حالات کو ناقابلِ تغیر حالات کے جبر سے مقابلے کی حوصلہ مندی اور ان کو عدل و مساوات کے شعور کے ساتھ بدلنے کی کوشش اس نظریے کے بنیادی پتھر ہیں۔ اس لیے ترقی پسند ادب ابلاغ کا بھی قائل ہے اور حالات کے جبر سے لڑ کر انھیں بدلنے کی آزادی کا بھی۔ ایسا ادب یاسیت کا پرچار کرنے کے بجائے انسان کو زندہ رہنے اور جدوجہد کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے نزدیک انسان پٹا ہوا ذلیل کیڑا نہیں، باوقار، حوصلہ مند اور آزاد، با اختیار وجود ہے۔ جسے جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ معاشرے نے غلام بنا رکھا ہے لیکن وہ اپنے اختیار سے کام لے کر ان استحصالی معاشروں کی کایا پلٹ کر رکھ سکتا ہے۔ جدیدیت اور ترقی پسندی میں یہ نظریاتی فرق بڑا بنیادی فرق ہے۔'' ١٠

پنجاب کے جن غزل گو شعرا، نے جدیدیت کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اُن میں کمار پاشی، بانی، شہابؔ للت، کرشن ادیب، ساحرؔ ہوشیارپوری، نوبہار صابر، کے۔ کے۔ رشیؔ، بمل کرشن اشکؔ، ست نام سنگھ خمارؔ، مہیشؔ پٹیالوی، مصوّر سبزواری، ہیرا نند سوز، کرشن کمار

طور، مہر گیرا، پریم کمار نظر، خالد کفایت، اسلم حبیب، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، محمود عالم، انجم قادری، مہندر پرتاپ چاند، شرون کمار ورما، آزاد گلاٹی، ارمان شہابی، پریم وار برٹنی، طالب شملوی، تخت سنگھ، ڈاکٹر نریش، ڈاکٹر سلطان انجم، رمضان سعید، انوار آذر، مشتاق وارثی، ڈاکٹر محمد رفیع، ناشر نقوی، کشمیری لال ذاکر، گوپال کرشن شفق، شو دیال سحاب، ضیا صدیقی، آر۔ڈی۔ شرما تاثیر، پروین کمار اشک، زاہد ابرول، عزیز پریہار، کنور چوہان، پورن کمار ہوش، طلعت عرفانی، سریندر پنڈت سوز، گوپال متل، راجندر ناتھ رہبر، سدرشن کنول، اشک امرتسری، گوردیال سنگھ بھاٹیہ عارف، خمار جالندھری، باوا کرشن گوپال مغموم، سردار پنچھی، پتوں پرواز، کرشن پرویز، پونم کوثر، صابر ابوہری، ساحر کپور تھلوی، امرت پال سنگھ شیدا، جوہر بھارتی، ناز بھارتی وغیرہ کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر ہیں۔ یہاں فہرست سازی مقصود نہیں ہے باب سوم میں 'جدیدیت' عنوان کے تحت پنجاب میں جدیدیت کے رجحان کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	بشیر بدر	۲۴_۱۲۳
۲۔	غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۳۰۶
۳۔	غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۳۰_۳۳۱
۴۔	اظہار	آزاد گلاٹی	۳۷
۵۔	غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۳۲۲
۶۔	اردو غزل اور تقسیم ہند	محمد قمر الحق	۷۶_۷۸
۷۔	اردو غزل اور تقسیم ہند	محمد قمر الحق	۸۱_۸۲

۸۔	اُردو غزل آزادی کے بعد (ہندوستان میں) ڈاکٹر شمیم حنفی، مشمولہ اُردو ادب آزادی کے بعد	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۱۵۷
۹۔	اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۱۵۹
۱۰۔	ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر	پروفیسر قمر رئیس / سیّد عاشور کاظمی	۹۰۔۹۱

باب سوم

اُردو غزل میں پنجابی کلچر

جغرافیائی طور پر پنجاب کی پہچان ایک زرخیز اور سرسبز و شاداب خطے کے طور پر ہوتی رہی ہے۔ پنجاب اپنے الگ کلچر کی وجہ سے بھی دنیا بھر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کا مزاج اور مخصوص طرزِ معاشرت نے پنجابی کلچر کو جنم دیا ہے۔ پنجابی طرزِ زندگی کے گوناگوں پہلو جن میں یہاں کے لوگوں کا رہن سہن کا ڈھنگ، روایات و رسومات اور حکایتیں، اخلاق و کردار، بیاہ شادی کی رسومات و توہمات، دیہات و قصبات، کھیت کھلیان، موسم اور تہوار، زیورات وملبوسات، کھان پان، پانی کی مٹھاس اور تازگی، دریاؤں کی کشادگی، مٹّی کی سوندھی سوندھی خوشبو یہاں کا لوک ادب، ماہیے، ٹپّے اور ڈھولے لوک ناچ گِدّھا، بھنگڑہ، جھومر، سَمّی، پنجابی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زندگی کو کُھل کر جینے کی چاہت، جوش و ولولہ، مستی و سرشاری، اُمنگ و ترنگ، خودداری، انا اور جانبازی و جواں مردی، جسمانی شکوہ و جمال اور جلال۔ یہ پنجابی کلچر کے اہم عناصر ہیں جنھوں نے پنجاب اور پنجابیت کو ایک ایسی شناخت عطا کی ہے جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے کلچر میں نہیں ملتی۔ یہاں کے لوک ادب میں ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، سسّی پنوں، مرزا صاحباں، پورن بھگت، روپ بسنت وغیرہ کے عشقیہ قصے بھی شامل ہیں۔ پنجاب اور پنجابیت کو سمجھنے کے لیئے راجندر سنگھ کا درج ذیل اقتباس جس میں انھوں نے پنجابی کلچر کے واضح خدوخال اُبھارے ہیں۔ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

''وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اُٹھتی ہے۔اس کے دریا تو ایک طرف، پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔۔۔ جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھکڑ، وہ خود ہی اپنے قانون بناتے

ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی انہیں توڑ دیتے ہیں اور پھر نئے قانون واضع کرنے کے لئے چل نکلتے ہیں۔۔۔انہوں نے بہت دُکھ دیکھا ہے۔۔اُنہوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت دی ہے، پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت بچانے کے لیے۔۔۔وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اس مٹی کو کھنگال کر اس میں کندن پیدا کر لیتے ہیں۔عجب کیمیا گر ہیں وہ۔۔۔پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر ہنس لیتا ہے۔وہ اچھا دوست ہے بُرا دُشمن۔۔۔جہاں بھی لوگ تمہیں ایک بُلند آواز سے ہنستے قہقہہ لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا۔وہ جو اندر ہے وہی باہر ہے۔اس کا جیون کا رہسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں۔۔۔وہ ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ سکتا ہے۔اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ و دل میں سما گئی ہے اور ہواؤں کی مستی دماغ میں۔۔۔پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔نہ معلوم انہوں نے کون سی امر کتھا سُنی ہے جس میں وہ اُونگھ بھی گئے اور پا بھی گئے، پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپسیا پوری نہیں ہوتی ۔۔۔ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے میں اُن کا موکش ہے۔" [1]

اُردو ادب میں پنجاب اور پنجابیت کی جو گہری چھاپ ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

"پنجابی لہجہ، آہنگ، تلفظ اور محاورہ شروع ہی سے اُردو زبان کے مزاج اور خون میں شامل رہا ہے۔اُردو کی روایت اور تاریخ میں پنجاب اسی طرح شامل ہے جس طرح انسانی رگوں کے اندر دوڑتے تازہ خون میں سُرخ وسفید جسیمے" [2]

وزیر آغا کی اس بات سے بھی کسی طور اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ:

"جب پنجاب کا ادیب اُردو زبان میں لکھتا ہے تو اپنی جنم بھومی کی ساری بُو،

باس، مزاج اور لہجے کو اُردو میں منتقل کرنے پر مجبور ہوتا ہے“ [۴۳]

اور آزاد گلاٹی لکھتے ہیں:

”اگر اُردو ادب سے پنجاب کی یہ بو باس منفی کر دی جائے تو اس میں تنوع اور دل چسپی کے کتنے ہی ابعاد منفی ہو جائیں گے“ [۴۴]

پنجاب کے اُردو شعراء نے پنجابی کلچر کو نہایت سلیقے سے اپنے تخلیقی عمل کے دوران اپنی نگارشات میں پیش کیا۔

گھنگرالے کنڈلوں سے جھکتی کھڑاؤں تک
اک گیت تھا کہ پھیل گیا اگلے گاؤں تک

(بمل کرشن اشک)

پت جھر کی کالی راتوں میں آنکھیں چندھیا جاتا ہے
ماضی کی انگنائی میں دو لونگوں کا اشکارا سا

(بمل کرشن اشک)

چھوڑ آیا گاگر سی چھلکتی آنکھیں
بارہا خواب میں پنگھٹ نظر آتا ہے

(پریم کمار نظر)

سُنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

(انشا اللہ خاں اِنشاء)

ایک ہٹیلے پھول کی خاطر کچھ شمشیریں جمع کرو
دل رانجھا ہے اس کے لیے پنجاب کی ہیریں جمع کرو

(پریم وار برٹنی)

جب گبرو اُس پار سدھارے چاندی ہوئی کمہاروں کی

کچے گھڑے ڈھونڈنے نکلا اک جمگھٹ نیاروں کا

(بمل کرشن اشکؔ)

سوالِ وصل بھی تو ہے جوابِ ہجر بھی تو
چناب بھی ہیں تیرے اور گھڑے بھی تیرے ہیں

(پریم کمار نظرؔ)

پکّے گُڑ کی خوشبو پھیلی بھونرالی راتوں میں جب
گاؤں کا رستہ ٹھک ٹھک کر من کو کرے اشارا سا

(بمل کرشن اشکؔ)

اُردو کا پنجاب سے جو رشتہ ہے اُسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ادب کا پنجاب سے اور پنجاب کے کلچر کا اُردو سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور سمجھنا اندھیرے میں تیر چلانے جیسا عمل ہے۔

پنجاب کے صوفی شاعروں نے بھی یہاں کے عشقیہ قصوں کو مثنویوں اور نظموں کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ وارث شاہ، شاہ حسین اور بابا فرید وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ شعراء کے علاوہ پنجاب کے نثر نگاروں نے بھی اپنی تخلیقات میں پنجاب کے کلچر کی بھرپور عکاسی کی ہے بطور خاص بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو، جوگندر پال، شرون کمار ورما کے افسانوں میں اور کنہیا لال کپور، فکر تونسوی کی طنز و مزاحیہ تحریروں میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں بھی پنجابی کلچر کی جھلک نظر آتی ہے۔ غرض کہ پنجاب کے اُردو شعری ادب کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں پنجاب کی ثقافتی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے کہ جو پنجاب کے اُردو ادب کو نئے ابعاد سے روشناس کرتی ہے۔

۱	پربودھ اور میتری۔ آجکل دہلی		۱۵ اور ۲۲
۲	تاریخ اُردو ادب حصہ اوّل	جمیل جالبی	
۳	نئے تناظر۔ اُردو اور پنجابی کا باہمی رشتہ		۹۲
۴	اذکار	آزاد گلاٹی	۴۳

باب چہارم

اردو غزل پر جدید ادبی رجحانات کے اثرات

باب چہارم (الف)

ترقّی پسند تحریک

علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک دوسری بڑی اور توانا تحریک تھی جس نے کم و بیش ہندوستان کی تمام زبانوں کے فنکاروں کو متاثر کیا اور جس کی بازگشت ہندوستان کی ہر زبان کے ادب میں سنائی دیتی ہے۔ یہ تحریک ملک کے کونے کونے تک پہنچی۔ اس کے اثر سے ٹیگور اور اقبالؔ بھی محفوظ نہیں رہے۔ اقبالؔ کے آخری ایام کی شاعری میں ترقی پسندی کی گونج صاف سنی جا سکتی ہے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشہء گندم کو جلا دو

ترقی پسند تحریک کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے جو صرف ایک زبان تک محدود نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی ہر زبان کے بہترین ادیب اس تحریک سے وابستہ ہیں ویسے اس کے لیے یہ سعادت بھی کچھ کم نہیں کہ اس کو ٹیگورؔ اور پریم چند اور جوشؔ ملیح آبادی کی سرپرستی نصیب ہوئی اور اقبالؔ کی دُعائیں ملیں۔ اس کے پہلے اعلان نامے پر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین اور نیاز فتح پوری کے بھی دستخط تھے اور اس کے نوجوان قافلے میں نومشق ادیبوں کی ہمت افزائی کے لیے مجنوں گورکھپوری اور مولوی عبدالغفار جیسے پختہ ادیب شامل ہیں''[1]

اس تحریک کے بانی ملک راج آنند اور سجاد ظہیر تھے۔ سجاد ظہیر نے ۱۹۳۵ء میں لندن سے ہندوستان واپس آ کر اس تحریک کو عوامی تحریک بنانے کے لیے باقاعدہ کوششیں شروع کیں۔ اُس وقت کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ کیا گیا اور انہیں اس تحریک کے اغراض و مقاصد بتائے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں اس کی پہلی کُل ہند کانفرنس ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ ترقی پسندوں نے اپنے پہلے منشور میں جن خاص باتوں پر زور دیا تھا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ادب کا تعلق زندگی کی حقیقتوں سے جوڑا جائے۔ جذبات و احساسات کے ساتھ فکر و شعور کو بھی ادب میں جگہ دی جائے۔ اندھی تقلید اور قدامت پرستی سے بچا جائے۔ ادب میں انسانیت، جمہوریت، اخوت اور مساوات کی ترجمانی کی جائے۔ اس تحریک کے کچھ خاص مقاصد و موضوعات تھے جن کے پیشِ نظر تقریباً تمام ترقی پسندوں نے اپنا زورِ قلم آزمایا اور ایک خاص قسم کا مقصدی ادب تخلیق کیا۔ چونکہ یہ تحریک مارکس کے نظریہء اشتراکیت اور اجتماعیت کی حامل تھی اس لیے اس تحریک سے مارکسزم کے نظریات کو تقویت ملی۔ ترقی پسندوں نے سرمایہ دارانہ نظام اور طبقاتی کشمکش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مزدور، کسان، افلاس، بے روزگاری، سرمایہ داری، طبقاتی کشمکش وغیرہ کے موضوعات پر ادب تخلیق کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے نظریات و مقاصد کی اشاعت و تبلیغ کے لیے فکشن اور نظم جیسی بیانیہ اصناف کا انتخاب کیا گیا۔ بے شک ترقی پسند دور میں اردو غزل کی رفتار سُست رہی اور نظم کے مقابلے میں کم غزلیں لکھی گئیں لیکن غزل اپنی بقا اور احیاء کے لیے برابر سرگرمِ عمل رہی۔ اس دوران جو غزلیہ شاعری کی گئی اس پر ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جن ترقی پسند شاعروں نے غزل کو اشتراکیت کی نظر سے دیکھا ان میں فیضؔ احمد فیضؔ، جاں نثار اخترؔ، مخدومؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، جذبیؔ، مجروحؔ، وامقؔ اور ظہیرؔ کاشمیری قابلِ ذکر ہیں۔

موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے تمام ترقی پسندوں کے ہاں یک رنگی پائی جاتی

ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت اور اشتراکیت کو اہمیت دی گئی ہے۔ یہ ایک وقتی تحریک تھی۔ جس کے موضوعات وقتی اور سیاسی تھے اسی لیے ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک دم توڑ گئی۔

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء کو سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اُن سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے لیے ماحول پیدا کیا اور اس تحریک کو ملکی پیمانے پر ہمہ گیریت اور مقبولیت عطا کی۔ دراصل ۱۸۵۷ء کے غدر ہی سے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے لیے ماحول تیار ہو چکا تھا جس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کی پکڑ مضبوط ہو چکی تھی اور انگریزوں نے ہندوستانیوں کے خلاف جارحانہ رویہ اپنالیا تھا۔ روز بروز انگریزوں کے تشدد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ایک طرف انگریز ہندوستانی عوام پر نئے نئے ستم ایجاد کر رہے تھے وہیں دوسری طرف جاگیردانہ نظام غریب، کسان اور مزدوروں کا خون چوس رہا تھا۔ اہلِ ہند کو سامراجی طاقتوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بیدار و متحد کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ ملک کے سیاسی حالات سے قطع نظر عالمی پیمانے پر ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں نے بھی ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے لیے ماحول تیار کیا۔ پہلی عالمی جنگ اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء کے روس کے انقلاب نے ہندوستانیوں کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بقول سجاد ظہیر:

''پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہمارے ملک میں زبردست سیاسی ہلچل پیدا ہوئی۔ جنگ کے زمانے میں انگریز سرکار نے ہمارے ملک کا شدید استحصال کیا تھا۔ جنگ کے بعد اقتصادی حالات اور بھی خراب ہوئے۔ انگریز سامراجیوں نے لڑائی میں جو چوٹ کھائی اُسے وہ ہندوستان کی دولت کو لوٹ کر اچھا کرنا چاہتے تھے۔ زرعی اور خام پیداوار کے دام یک بارگی گھٹ گئے۔ جس سے خام مال اور زرعی پیداوار کرنے والوں کی مالی حالت یک

بارگی خراب ہوگئی۔ ادھر شہروں میں فیکٹریوں اور کارخانوں کے بند ہونے، فوجی دفتروں میں چھانٹی اور سپاہیوں کے ڈسچارج ہونے سے بے روزگاروں کی تعداد میں لاکھوں کا اضافہ ہوا۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں کو بھی افراطِ زر کی وجہ سے بحرانی حالات سے دوچار ہونا پڑا''

''دوسری طرف انقلابِ روس نے راج شاہی کا تختہ اُلٹ کر سارے ایشیا کی محکوم قوموں میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑادی تھی۔ وسطی ایشیا کی قوموں نے روسی سامراجیوں کا چولا اُتار دیا۔ ایران اور ترکی روس کی انقلابی، مزدور اور کسان حکومت کی مدد اور حمایت حاصل کر کے انگریز سامراجیوں کو اپنے اپنے ملکوں سے نکال رہے تھے۔ چین میں سامراجیوں کے اقتدار کے خلاف مسلّح قومی جدوجہد جاری ہوگئی تھی''[۲]

یہی وہ ملکی اور بین الاقوامی حالات تھے جنہوں نے ہندوستان میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کی حمایت کے ساتھ ساتھ سامراجی طاقتوں کے خلاف قلم کاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ادب برائے زندگی کے نظریے کو فروغ دیا۔ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سہرا اُن نوجوان طلبا کے سر ہے جنھوں نے ۱۹۳۵ء میں لندن میں ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں حصہ لیا اور جو خود بھی ادیب بننے کی شعوری کوششوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے نہ صرف اشتراکی مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا بلکہ ترقی پسند ادب کی تخلیق میں بھی حصہ ڈالا۔ اس سلسلے میں ترقی پسند تحریک کے بانی و موسس خود فرماتے ہیں۔

> ''ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفہ کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور اُن کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکسی اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع

کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعے کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوئے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک لامتناہی تحصیلِ علم کی ابتدا تھی'' ''ہمارے چھوٹے سے گروہ میں اکثر مصنف بننا چاہتے تھے اور کرتے بھی کیا؟ مزدوری کی ہم میں اہلیت نہ تھی کسی قسم کا ہنر ہم نے سیکھا نہ تھا۔ سامراجی سرکاری نوکری کے خیال سے گھن آتی تھی تو پھر باقی کیا رہا؟'' [3]

اُن دنوں جو ہندوستانی نوجوان لندن میں قیام پذیر تھے اور جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے جلسوں میں حصّہ لیا اُن میں سجّاد ظہیر اور ملک راج آنند کے علاوہ جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور محمد دین تاثیر کے نام لیے جاسکتے ہیں یہ تمام لوگ لندن ہی میں سجّاد ظہیر کے کمرے پر ہونے والی میٹنگوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے اور ترقی پسند تحریک سے متعلق موضوعات پر بحث و تقریر کیا کرتے تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور مطالعے کے شوق نے انھیں ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ اِن لوگوں نے اتفاق رائے سے سجّاد ظہیر کو انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا صدر بھی چُن لیا تھا۔

لندن ہی کے ایک ہوٹل میں ترقی پسند مصنفین کی ماہانہ ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں روشن خیال اور انسان دوست ادیبوں کو بیدار کرنے کی بات کی گئی تا کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے عوام کی خدمت کرسکیں اور اپنے ملک کو سامراجوں کے شکنجے سے آزاد کرسکیں۔

اِن جلسوں میں جس بات پر خاص زور دیا گیا وہ یہ کہ ادیبوں اور شاعروں کو اپنے نہاں خانوں سے نکل کر صدقِ دِلی سے انسانوں کے مجموعی مفاد کے لیے ادب تخلیق کرنا چاہیے۔ خود کو اور اپنے قلم کو انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ شاید اسی لیے پریم چند نے ''ہنس'' کے خصوصی اداریہ میں لکھا تھا۔

''اگر یہ انجمن اپنی راہ پر قائم رہی تو ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا''۔[۴]

سہ ماہی ''گفتگو'' کے ترقی پسند ادب نمبر میں چھپے اعلان نامے میں کہا گیا ہے کہ:

''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے اندازِ تنقید کو رواج دیں۔ جس سے خاندان، مذہب، جنس جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جاسکے۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کونشو و نما دینے سے روکیں۔ جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں'' ''ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی الفاظ کے گڈھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کا عکاس اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں''۔[۵]

مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں درج ذیل مقاصد طے کیے گئے ہیں۔

۱۔ تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشوراتی جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

۲۔ ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدّ و جہد کر کے اہلِ ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

۳۔ ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

۴۔ آزادیِ رائے اور آزادیِ خیال کی حفاظت کرنا۔

ترقی پسندوں کو اس بات کا بھی گہرا شعور تھا کہ اگر وہ ادب سے محض اشتراکیت

کے خیالات ونظریات کی ترویج وتبلیغ کا کام لیں گے تو اس سے ادب مجروح ہوگا اور ادب ایک اشتہار بن کر رہ جائے گا۔ بقول منظر اعظمی:

''اگرچہ ترقی پسند مصنفین ادب میں اشتراکی خیالات کی ترویج کو بنیادی مقصد بنائے ہوئے تھے لیکن وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ ادب پر اشتراکیت کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی تصور کی گرفت سخت رکھنے سے اس کی ادبی حیثیت یقیناً مجروح ہوگی اور وہ ادب، ادب کے بجائے اشتراکیت کا اشتہار بن کے رہ جائے گا یہی وجہ ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (اپریل ۱۹۳۶ء) منعقدہ لکھنؤ میں جب مولانا حسرت موہانی نے اپنی تقریر کے دوران صاف صاف کہا کہ ''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم بلکہ کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے''[۶]

تو سجاد ظہیر نے اس کی وضاحت کی کہ:

''ترقی پسند ادبی تحریک میں سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ مختلف عقائد کے لوگوں کے لیے جگہ تھی۔ انجمن ان سے وطنی آزادی اور جمہوریت میں یقین رکھنے کا مطالبہ کرتی تھی اشتراکیت میں نہیں۔ مولانا اس معاملے میں انتہا پسند تھے۔ انکے نزدیک ایک ترقی پسند کے لیے اشتراکی ہونا ضروری تھا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں تھا''[۷]

ترقی پسند تحریک کی بنیاد عدل اور مساوات جیسی اقدار ہیں۔ سرمایہ داری جب اپنے عروج پر پہنچی تو اس نے یوروپ میں بیسویں صدی میں بڑے تباہ کن اور تخریبی حالات پیدا کیے۔ سرمایہ دارانہ نظام انفرادیت کا علم بردار ہے اور ترقی پسندی اجتماعیت اور انسان سے انسان کے رابطے کی۔ ترقی پسندوں کے نزدیک ادیب کا کمیٹ منٹ (Committment) زندگی کو بڑھاوا دینے والا ہونا چاہیے۔ ترقی پسند مصنفین کی اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی پہلی کُل ہند کانفرنس ادب کی تاریخ میں عموماً اور ترقی پسند ادبی

تحریک کی تاریخ میں خصوصاً یادرہے گی اس کانفرنس میں حسرت موہانی، پرکاش نرائن، کملادیوی، چٹوپدھایہ ایسے لوگوں نے شرکت کی اور اُردو ہندی کے علاوہ گجراتی، مراٹھی، تامل اور بنگلہ زبانوں کے ادیبوں نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس میں تحریک سے متعلق مسائل و موضوعات کے علاوہ ہندوستان کی زبانوں کو درپیش مسائل پر بھی بحث کی گئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اس کانفرنس کی صدارت اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی تھی اور اس تحریک سے متعلق اعلان نامہ بھی پیش کیا گیا تھا پریم چند نے جو خطبہ پیش کیا اُس نے ہمارے ادیبوں کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ ہی بدل ڈالا۔ ڈاکٹر صادق کے لفظوں میں:

''انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس نے پورے ملک کے قلم کاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس سے پہلے قلم کار یا تو سوزشِ دل سے مجبور ہو کر قلم اُٹھاتے تھے یا تسکینِ طبع کے لیے۔ تفریحِ طبع اور شہرت کی خاطر لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ سر سیّد اور اُن کے رُفقا نے قومی اصلاح کے مقصد کی طرح ضرور ڈالی تھی۔ لیکن شعر و ادب کو اعلان نامے کے تابع کرنے ''ترقی پذیر رجحانات کی نشو ونما میں حصہ لینے، فنونِ لطیفہ کو عوام کی جدو جہد کا ترجمان بنانے، بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل کو اپنا موضوع بنانے، رجعت پسند رجحانات سے نبرد آزما ہونے، ملک کی آزادی کے لیے لڑنے، آزادیِ رائے اور آزادیِ خیال کی حفاظت کرنے اور اس طرح کے دیگر رجحانات سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا''۸؎

ترقی پسندوں نے جہاں آزادیِ خیال اور آزادیِ رائے پر زور دیا ہے وہیں اُن کے نزدیک انفرادیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ادب کے بارے میں اُن کا نظریہ یہ تھا کہ ادب اجتماعی اور عوامی ہونا چاہیے اُن کے نزدیک ادب میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے بقول اختر انصاری:

''ایک یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق

رکھتا ہواور دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے''۹

ہمارے بہت سے ادیب و نقاد ادب میں انفرادیت کے قائل ہیں وہ ترقی پسندوں کے انفرادیت کُش رویہ کے سخت مخالف ہیں اور ادب کے اشتراکی دستورالعمل کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

اُردو کے مشہور و معروف نقاد مجنوں گورکھپوری بھی ادب میں انفرادیت کے قائل ہیں اور ادب میں انفرادیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب تک انسان ،انسان ہے اس وقت تک اس کے اندر انفرادیت باقی رہے گی۔ اور کوئی اشتراکی یا انقلابی دستورالعمل اس کو ایک دم فنا نہیں کرسکتا''۱۰

آل احمد سرور کا نظریہ بھی مجنوں گورکھپوری سے کافی ملتا جلتا ہے۔''نئے اور پرانے چراغ''میں آل احمد سرور رقمطراز ہیں کہ:

''میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو شاعر و ادیب کی انفرادیت کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔مختلف شاعروں اور ادیبوں کو مختلف صلاحیتیں ملتی ہیں۔انھیں اُن سے اپنے طور پر کام لینا چاہیے۔اپنے مزاج تجربے اور مخصوص و منفرد حسیاتی شعور کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمیں اس انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ماحول اور اس کی ضروریات سے بے نیاز ہونے کی ضرورت نہیں''۱۱

ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں جس نئے دور کا آغاز کیا اور زندگی کے جن مسائل و موضوعات کو ادب کا حصہ بنایا نیز ادب میں جو فعالیت و حرکت اور جوش و ولولہ پیدا کیا اور ادب کو رجعت پسندی اور افسردگی سے نکال کر زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کیا۔ ادب کو نیا اظہار و اسلوب عطا کیا اس ضمن میں ڈاکٹر شارب ردولوی نے لکھا ہے کہ:

''ترقی پسند تحریک نے ادب کی تعریف و تفہیم، مواد و ہیئت کے رشتے، رمزیت و اشاریت، حقیقت نگاری، ادب و سماج، اجتماعیت و انفرادیت اور اظہار و اسلوب کے مسائل پر جس بحث کا آغاز کیا وہ اس بنا پر بہت اہم تھی کہ ادب کے مسائل پر اس وسیع تناظر میں اس سے پہلے گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اس میں ادیب، قاری، نقاد سب کو شریک کر کے تنقیدی شعور اور بصیرت پر جلا کی اور فکری و ادبی مسائل پر غور و خوض کی ابتداء کی جن سے ادب میں نئے تجربات کیلئے راہ ہموار ہوئی''[۱۲]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑا اور عوامی مسائل کو ادب کا موضوع بنایا لیکن حقیقت نگاری اور راست بیانی نے اُردو ادب کو رمز و کنایات اور ادبی جمالیات سے عاری کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب ادبی چاشنی سے محروم ہو کر بے کیف و بے ذائقہ ہو گیا۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''اس سلسلے میں سب سے زیادہ کوتاہی یہ ہوئی کہ جمالیات پر توجہ نہ ہوئی۔ مارکسی نقادوں نے موضوع کی اہمیت پر زیادہ زور دیا۔ تاریخی اور تہذیبی عوامل بیان کیے۔ اقتصادی رشتوں کی نوعیت واضح کی۔ سامنتی تمدّن اور سرمایہ دارانہ دور کی میکانکیت کا ذکر کیا۔ فکر اور فن کی وحدت کی طرف بھی اشارہ کیا اور ہیئت پرستی کی خامیاں گنائیں۔ مگر حسن کے متعلق یہ کہنا کافی سمجھا کہ ''ہمیں حسن کا تصور بدلنا ہوگا'' مجموعی طور پر ترقی پسند تنقید حسن کے معیار واضح کرنے سے زیادہ ادب کی تعبیر و تفسیر اسی طرح کرتی رہی کہ اس سے زندگی کو بدلنے میں مدد ملے''[۱۳]

ترقی پسندوں نے ادب کے حسن و جمال پر موضوع اور مواد کو اہمیت دی اس سلسلے میں وہ ہیئت و اسلوب کے مقابلے میں بھی مواد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ زندگی کی حقیقتوں اور مسائل کو من و عن بیان کرنے ہی میں یقین رکھتے ہیں پروفیسر احتشام حسین نے صحیح

لکھا ہے کہ:

''ترقی پسند ادب کا زاویہ ءنظر مواد اور ہیئت کے تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعرا اور نقاد جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں جو مقدار سے خصوصیتوں کو بدلنے کے قائل ہیں۔ جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں۔ جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدّن کو عام کردار اور فنونِ لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کسی حالت میں بھی ہیئت و اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں''۔[۱۴]

ترقی پسند قلم کار زندگی کے کسی ایک شعبے یا ادب کی کسی خاص صنف تک ہی ترقی پسندی کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں ترقی پسند نظریے کے قائل تھے اس لیے انھوں نے ادب کی سبھی اہم اصناف کو اپنے دائرہ کار میں شامل کیا اور اس طرح اردو کی کم وبیش سبھی اصناف کے ادیب وقلم کار ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوتے گئے اور اس تحریک کا دائرہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

''یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ تحریک کے مقابلے میں ترقی پسند تحریک کا دائرہ اور اس کے تصوّرات کا حلقہ زیادہ وسیع تھا اور اسی نسبت سے اس کا دائرہ اثر بھی زیادہ دور رس ثابت ہوا۔ عہدِ جدید میں اُردو کے ممتاز اور بلند قامت ادیبوں کی اکثریت اِن ہی دو تحریکوں سے وابستہ رہی ہے''۔[۱۵]

ترقی پسند تحریک کی فکری بنیاد جہاں عوام اور اشتراکیت ہے وہیں تیسری بنیاد سیاست بھی ہے ترقی پسندوں نے سیاست سے متعلق مسائل وموضوعات پر خوب زورِ قلم آزمایا ہے جس کا بیّن ثبوت وہ تمام تخلیقات ونگارشات ہیں جن میں سیاسی نظام حکومت کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار ہوا ہے۔ ترقی پسندوں کا عقیدہ تھا کہ سیاست کا ادب پر اور ادب کا سیاست پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ ترقی پسندوں کے اس نقطہ ءنظر کے بارے میں منظر اعظمی رقمطراز ہیں کہ:

''ترقی پسند مصنفین کا نکتۂ نظر یہ تھا کہ ادب اپنے دور کی سیاست کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جس زمانے میں سیاست اور سیاسی تنظیمیں صاحب اقتدار اور بالائی طبقے کی ملکیت ہوتی تھیں اور عوامی طبقے جمود اور بے حسی کا شکار تھے۔ ادب اور سیاست کا تعلق بھی سرسری سطحی اور معمولی تھا لیکن جب عوام میں سماجی احساس بڑھا اور سیاسی شعور پیدا ہوا۔ اور خود سیاسی مسائل زیادہ اہم ہو گئے تو ادب اور سیاست کا تعلق بھی گہرا ہو گیا۔ اور سیاست کو کسی بھی حال میں جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس تصوّر نے ادب میں سیاست کو رنگ و آہنگ تو بخش دیا مگر سیاست نے ادب کو اس کے اصل حسن و رنگ سے محروم کر دیا'' [16]

ادب اور سیاست کے تعلق سے پنڈت جواہر لال نہرو نے آلہ آباد میں منعقدہ ترقی پسند تحریک کی دوسری کُل ہند کانفرنس میں جو تقریر کی یہاں اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے:

''ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعیت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں'' [17]

متذکرہ بالا تمام حقائق و اقوال کی روشنی میں ترقی پسند تحریک کا مجموعی جائزہ لینے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترقی پسند ادب کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی جینے کا حوصلہ دیتا ہے اور سنگین سے سنگین حالات کو بدلنے کا بھی عزم و حوصلہ بخشتا ہے ترقی پسند ادب نہ صرف حالات کو بدلنے کا قائل ہے بلکہ جابروں اور ظالموں سے اپنا حق چھین کر حاصل کرنے کا بھی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب داخلی اور خارجی دونوں حقیقتوں کا حامل ہے۔ ترقی پسند ادیب نہ محض خارجی زندگی پر زور دیتے ہیں اور نہ صرف داخلی زندگی پر۔ ترقی پسندوں کے نزدیک خارجی اور داخلی زندگی میں توازن بنائے رکھنا بہت ضروری ہے۔

ترقی پسند ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک سے وابستہ شاعروں کے ہاں نظموں اور غزلوں میں بھی طبقاتی کشمکش سے پیدا شدہ سنگین مسائل کا پختہ اور بھرپور شعور ملتا ہے اس عہد کی غزلوں اور نظموں میں نئے دور کی آواز سنائی دیتی ہے۔

اگر اقبال کی بات کی جائے تو اُن کے آخری ایام کی شاعری کے بہت سے اشعار اور بعض پوری کی پوری نظمیں ترقی پسند تحریک سے جذبات پذیری کی عمدہ مثال پیش کرتی ہیں سردار جعفری اقبال کی شاعری کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے شعوری طور پر ادب اور سماج کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی اور یہیں سے جدید اردو ادب کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کوششوں کی ابتدا سرسیّد، حالی اور شبلی سے ہوئی اور اقبال نے اِسے آگے بڑھایا''[18]

اقبال کی شاعرانہ عظمت کا احترام بڑی عقیدت مندی سے کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ:

''ابھی تک اُردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے وہ ہمہ گیری اور وسعت ابھی تک کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ یہ قومی تحریک آزادی کی ابتدائی اُبال کا زمانہ تھا جو اپنے سارے تضاد کو لے کر اقبال کی شاعری میں ڈھل گیا''[19]

مشترکہ پنجاب کے جن غزل گو شاعروں نے ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کی اور اس تحریک کے اثرات کو قبول کیا اُن میں فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، جگن ناتھ آزاد اور پریم وار برٹنی کے نام قابل ذکر ہیں چونکہ ہماری تحقیق کا موضوع منقسم پنجاب ہے اس لیے یہاں انھیں شاعروں پر زیادہ بحث کی گئی جن کا تعلق ہندستانی پنجاب سے ہے۔ جب ہم ترقی پسند تحریک کی روشنی میں پنجاب کی اردو غزل کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں فیض احمد فیض ایسے پہلے شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے محبت کے تصور کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ فیض جیسا شاعر جس کی شاعری کا اصل موضوع عشق مجازی تھا پر

مظلوموں کی آہ وفغاں اور مادرِ وطن کی غلامی کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے غمِ جاناں پر غمِ دوراں کو ترجیح دینا مناسب سمجھا۔ اُن کی نظم کا ایک شعر ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سِوا

فیضؔ

فیضؔ نے باوجود ترقی پسند تحریک کے ہم نوا ہونے کے اپنی غزلوں میں غزل کی مخصوص علامتیں استعمال ضرور کی ہیں لیکن الگ معنی ومفہوم کے ساتھ۔ جب وہ محبوب کی بات کرتے ہیں تو اُس سے مُراد ملک یا قوم ہوتا ہے اور جب وہ رقیب سے مخاطب ہوتے ہیں تو اس کا مطلب ملک وقوم کا دُشمن یا غدّار ملک ہوتا ہے۔ فیضؔ نے اپنی غزلوں میں فنی پابندیوں کا پورا خیال رکھا ہے۔ فیضؔ کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں اندازِ تخاطب پایا جاتا ہے اور جن میں شعریت کم ہے لیکن اُن کی اکثر غزلوں میں دلکش ترنم اور شعریت موجود ہے انہوں نے باوجود ترقی پسند شاعر ہونے کے اپنی شاعری میں رمز وکنایہ اور پُر لطف تشبیہات و استعارات سے کام لیا ہے۔ اُن کی شاعری کی لَو مدھم ضرور ہے بے ہنگم نہیں۔

مقام! فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیضؔ

چمن میں غیرتِ گل چیں پہ جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

فیضؔ

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُبھرنے لگتے ہیں

فیضؔ

فیضؔ کو لوح و قلم کی دولت چھن جانے اور اظہار و بیان کی آزادی پر پابندیاں لگ جانے کا بھی کوئی غم نہیں ہے۔ قید و بند کی صعوبتوں میں جب اُن سے ترسیل خیالات و جذبات کے تمام وسائل چھین لیے گئے تو ان وسائل سے ماوراہو کر کہتے ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
فیضؔ

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہء زنجیر میں زباں میں نے
فیضؔ

بلاشبہ مشترکہ پنجاب کے ترقی پسند شعراء میں فیضؔ اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ فیضؔ کے بعد ساحرؔ پنجاب کے دوسرے بڑے ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے محنت کش طبقے کی حمایت کی اور نسلی تعصب، فرقہ پرستی اور انسانی استحصال کے خلاف سب سے زیادہ لکھا۔ ساحرؔ نے شاعری کو عوام کی آواز بنایا اور ادب کو زندگی سے قریب تر کیا۔ ساحرؔ نے محنت کش طبقے کی نمائندگی ضرور کی ہے مگر کبھی ادبی معیار سے ہٹ کر نہیں لکھا۔ انہوں نے اپنی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی عوامی مسائل و موضوعات کو پیش کیا ہے۔ فلمی دنیا کے تقاضوں اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی ساحرؔ نے غیر معیاری ادب تخلیق نہیں کیا۔ ہر چند کہ ساحرؔ نے نظموں کے مقابلے میں بہت کم غزلیں لکھی ہیں لیکن اُن کی غزلوں میں ادب کی چاشنی، دلکشی اور جاذبیت موجود ہے نظموں کی طرح اُن کی غزلیں بھی دل کو چھوتی ہیں ساحرؔ نے جہاں امنِ عالم کے لیے جنگ کے خلاف ''پرچھائیاں'' جیسی طویل نظم اور عورت کے جنسی استحصال پر ''چکلے'' جیسی نظم لکھی ہے وہیں انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی بادشاہوں اور حاکموں کے قصیدے لکھنے کے بجائے فاقہ کش مزدور اور کسانوں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کرنے پر زور دیا ہے۔ ساحرؔ دبے کچلے لوگوں اور محنت کشوں اور مفلسوں کا مقدر سنوارنے کے خواہاں ہیں۔ ساحرؔ کو اس بات کا بھی احساس

ہے کہ بھوک کبھی آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی اور اگر حیات کا ماحول خوشگوار نہ ہوتو محبت کے گیت بھی نہیں گائے جا سکتے۔ المختصر یہ کہ ساحر لدھیانوی منقسم پنجاب کے واحد شاعر ہیں جن کے ہاں ترقی پسندی کا غالب رجحان اوّل تا آخر موجود ہے۔

عرصہ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے
رسمِ چنگیزی اُٹھی توقیرِ دارائی گئی

ساحر

مُفلسی حسنِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

ساحر

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی ہے

ساحر

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ساحر

ہو چکے اوصاف پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں

ساحر

من و سلویٰ کا زمانہ جا چُکا
بھوک اور آفات کی باتیں کریں

ساحر

تاج شاہی کے قصیدے ہو چکے
فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں

ساحر

ہر قدم مرحلہء دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

ساحؔر

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گذرے جدھر سے ہم

ساحؔر

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روز گار نے

ساحؔر

سرِ مقتل جنھیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منزل کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے

ساحؔر

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دِلی سے ہم

ساحؔر

ساحؔر لدھیانوی کے بعد جگن ناتھ آزؔاد اور پریؔم وار برٹنی کی شاعری پر ترقی پسندی کے اثرات ملتے ہیں۔ شعوری طور پر تو یہ شاعر اس تحریک سے وابستہ نہیں رہے لیکن ان کی شاعری میں بھی ترقی پسندی کا رجحان نظر آتا ہے۔ آزؔاد کی شاعری میں جہاں ہجرت اور وطن میں اجنبیت کا احساس شدّت اختیار کیے ہوئے ہے وہیں اُن کی غزلوں میں توانائی اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ملتا ہے اُن کے اشعار قنوطیت سے پاک ہیں۔ تقسیمِ ملک ،انسانی بے حرمتی اور قتل و خون کے بدلے میں ملنے والی آزادی سے ملک و قوم کا جو نقصان ہوا آدمیت کی لاش پر لہرانے والے پرچم، انسانی ترقی کے نام پر ہونے والی

تخریب، نئی روشنی میں چھپی ہوئی ظلمت اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو آزاد نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

فاتحِ بحروبر سبھی آج کا آدمی مگر
آدمیت کی لاش وہ دیکھ پڑی ہے بے کفن

جگن ناتھ آزاد

کچھ جیت کا احساس ہے، کچھ ہار کا احساس
معلوم نہیں اصل میں جیتا ہوں کہ ہارا

جگن ناتھ آزاد

تہذیب کا پرچم لہرایا ، ہر شہر و چمن ویران ہوا
تعمیر کا ہے ساماں جو یہی، تخریب کا ساماں کیا ہوگا

جگن ناتھ آزاد

ظلمتِ شب کی قسم پُر پیچ راہوں کی قسم
ساتھ دیں گے اب ترا اے ہمتِ مردانہ ہم

جگن ناتھ آزاد

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے
کارواں کے ساتھ ساتھ اِک غبار ہے تو کیا

جگن ناتھ آزاد

کبھی حوادث سے جنگ کر کے کبھی حوادث میں رنگ بھر کے
جنھیں تھا سودا سنوارنے کا انھوں نے قسمت کو یوں سنوارا

جگن ناتھ آزاد

انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے
دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک ہوئے

جگن ناتھ آزاد

وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اِس راز کو رہبر کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

جگن ناتھ آزاد

سماج کے اے قدیم ڈھانچے حیات سے تازگی چُرا کر
سنور رہا ہے تو کس لیے تو، تجھے تو اب ٹوٹنا پڑے گا

جگن ناتھ آزاد

بے چین و بے قرار و پریشاں ہے زندگی
اس پر بھی نغمہ ریزو غزالخواں ہے زندگی

جگن ناتھ آزاد

اے شاعرِ امروز کر انساں سے تخاطب
افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی

جگن ناتھ آزاد

اپنے جینے کی ادا بھی ہے انوکھی سب سے
اپنے مرنے کا بھی انداز نرالا ہوگا

پریم وار برٹنی

خودکشی کرلی بھرے گلشن میں جس نے بے سبب
میں نے سیکھا تھا اُسی ہم راز سے جینے کا ڈھب

پریم وار برٹنی

جب سے پہنا ہے نئے موسم نے زخموں کا لباس
پھول سے کھلنے لگے ہیں دیدہء خونباب میں

پریم وار برٹنی

سلیقہ ہے مجھے تاروں سے لَو لگانے کا
کہ میں چراغ نہیں داغ کے گھرانے کا

پریم وار برٹنی

پہلے تو بہت گردشِ دوراں سے لڑا ہوں
اب کس کی تمنا ہے جو مقتل میں کھڑا ہوں

پریم وار برٹنی

خرد کے پھول تو مرجھاگئے بہاروں میں
جنوں کا زخم خزاں میں ہرابھرا نکلا

پریم وار برٹنی

بعد کی نسل میں پنجاب کے ایسے بہت سے شعراء ہیں جن کے ہاں ترقی پسندی کا اظہار ہوا ہے اور ترقی پسند ادب سے جُڑے مسائل وموضوعات کو جنھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ مثلاً شباب للت، پروین کمار اشک، کرشن پرویز، سردار پنچھی، سدرشن کنول، ستنام سنگھ خمار اور آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر کے شعروں میں کہیں کہیں ترقی پسندی کے رجحان کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے یہاں اس بات سے قطعی غرض نہیں کہ ترقی پسندی کا یہ رجحان اُن کی شاعری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر پیدا ہوا۔ بہر حال شاعروادیب سماج کا حصہ ہیں سماج میں رہتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ سماج میں پیدا ہونے والی سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں سے بھی اثرات قبول کرتے رہتے ہیں اور اثر پذیری کا یہ عمل نوکِ قلم سے صفحہ قرطاس پر رقم ہوتا رہتا ہے۔

بچپن کو ہجرتوں نے کیا قلت آشنا
ہم مفلسی کی گود میں پل کر بڑے ہوئے

شباب للت

ہمارے شہر میں ایسا بھی ایک محسن ہے
نوالہ دے کے جو قسطوں میں جان لیتا ہے

پروین کمار اشک

مہک رہی ہیں گلابوں سے دھرتیاں سب کی
میں کیا کروں میری قسمت کا کھیت سوکھا ہے

پروین کمار اشک

مدّتوں سے پس رہے ہیں دستِ جابر سے غریب
پھر بھی اُن کے خون میں کیوں آئی طغیانی نہیں

گوپال کرشن شفق

جو بن رہی ہے عمارت ہے اس سمگلر کی
جو گر رہا ہے پُرانا مکان میرا ہے

گوپال کرشن شفق

جس کی رحمت چند لوگوں کے لیے مخصوص ہو
ہوگا کچھ لوگوں کا وہ سب کا خُدا کیوں کر ہوا

گوپال کرشن شفق

ہمیشہ دان دیتا ہے وہ مندر اور مسجد کو
مگر مزدور کے مُنہ سے نوالہ چھین لیتا ہے

سردار پنچھی

ہیں بہت دلکش ترقی کے یہ اعداد و شمار
بس ذرا فاقہ کشوں کی پسلیاں گن لیجئے

سردار پنچھی

گئے دن وہ جب شاعری قید تھی مغلیہ ونش کے راج دربار میں
اے نریشؔ آج مزدور دہقاں کے دکھ بھرے دل کی آواز ہے شاعری

ڈاکٹر نریشؔ

تعمیر کیے جس نے محل اوروں کی خاطر
ٹوٹے ہوئے چھپّر میں وہ سردی سے مرا ہے

شفیقؔ

ہُنر مندوں کو روٹی تک نہیں ہے
مگر جاہل وزارت کر رہے ہیں

کرشن پرویزؔ

بزرگوں کا پسینہ آپ کا مجرم رہا ہوگا
ہمیں ان کی جگہ بیتے ہیں پتھر توڑتے برسوں

سردار پنچھیؔ

مے خانے سے جھوم کے نکلے ہے جب مستی میں سرشار
مفلس مے خاروں کو دیکھ کے ہنستا ہے سرمایہ دار

سدرشن کنولؔ

اے آدمی، اسے کھوٹے کھرے کا نام نہ دے
یہ پیار ہے، کسی زردار کا ضمیر نہیں

سدرشن کنولؔ

اتنا بگڑا تو نہیں یارو مقدر میرا
کس کو معلوم ، ہو کل آج سے بہتر میرا

مہر گیراؔ

تو میری تشنہ لبی کو کوئی سراب نہ دے
مجھے تو آج ہی جینا ہے کل کا خواب نہ دے

مہر گیرا

غریب چہروں سے یہ جو فقر و غنا کے آثار ہیں نمایاں
کہیں فقیروں کی اس روش ہی سے ہو نہ برہم مزاجِ شاہاں

مہر چند کوثر

سوتے ہیں جو فٹ پاتھ پہ وہ سوچ رہے ہیں
گھر جن کے سلامت ہیں وہ گھر کیوں نہیں جاتے

ستنام سنگھ خمار

یہ بھوک کے مارے ہوئے لاچار سے بچے
ملتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھ رہا ہوں

تاثیر

جس دور میں انسان کی قیمت نہیں کوئی
اس دور کو تم آگ لگا کیوں نہیں دیتے

تاثیر

ہم نے دیکھے ہیں ایسے مقامات بھی
بک رہا ہو جہاں مفلسی کا بدن

عبداللطیف تبسم

حرم کے ساتھ شوالوں کی آرزو کی ہے
نئی سحر کے اُجالوں کی آرزو کی ہے

اسلم حبیب

کسی بھی حال میں ہم سے الگ ہمدم نہیں ہوتے
مسائل حل تو ہو جاتے ہیں لیکن کم نہیں ہوتے

ناشرؔ نقوی

ضرورت سایہء دیوار کی اُن کو ہی پڑتی ہے
کہ جن کے ہاتھ میں پہچان کے پرچم نہیں ہوتے

ناشرؔ نقوی

کوئی بھی تحریک جو برسوں کے حالات وواقعیات کی پروردہ ہوتی ہے یک لخط ختم نہیں ہوجاتی۔ تحریکیں اُبھرتی ہیں اور ختم ہوجاتی ہیں لیکن جو تحریک جتنی توانا ہوتی ہے اتنے ہی اُس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں ترقی پسند تحریک کُلی اور وقتی طور پر ضرور ختم ہوچکی ہے لیکن جزوی طور پر وقت کی سرد راکھ میں اس کی چنگاری آج بھی موجود ہیں جیسے ہی کوئی تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے تو یہ چنگاریاں اپنی موجودگی سے حرارت کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ پنجاب کے برگذیدہ شعراء کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے اثرات پنجاب کی نوجوان نسل کی شاعری میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

کہیں عہدہ کہیں پیسا ہمیشہ حاوی رہتا ہے
غریبوں کے مقدر اس طرح بھی پھوٹ جاتے ہیں

راجیش آنند اسیرؔ

فاقہ کشی نے عظمت کردار بیچ دی
بیٹوں نے باپ دادا کی تلوار بیچ دی

راجیش آنند اسیرؔ

سارا وقار لے گئی ہے آگ پیٹ کی
غربت نے آج غیرتِ فنکار بیچ دی

راجیش آنند اسیرؔ

میں جانتا ہوں کرب غریبی کا دوستو
بچپن گزار آیا ہوں مزدور کی طرح

سلیم زبیری

کسی کی عید بھی فاقہ کشی میں
کسی کے رات دن پیسا بہت

سلیم زبیری

زندگی لوگ یوں بھی کرتے ہیں
بھوک کھا کھا کے پیٹ بھرتے ہیں

ششی بھوشن چراغ

مختصر یہ کہ پنجاب کے شاعروں نے ترقّی پسندی کی روح کو سمجھا ہے اور ترقّی پسندی سے جُڑے مسائل وموضوعات کو اپنی شاعری کے ذریعے بخوبی پیش کیا ہے۔ جس کی تصدیق کے لیے مذکورہ بالا اشعار کافی ہیں۔ پنجاب کی اُردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات ومیلانات کا جائزہ لینے کے بعد یہاں مختصراً یہ بھی عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مجموعی طور پر ترقی پسندوں کے ہاں رومانیت آٹے میں نمک کے برابر ہے بلکہ ترقی پسندوں میں انتہا پسند، ادب میں رومانیت کے سخت مخالف تھے اُن کے ہاں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ سماج اور سیاست سے بغاوت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے اسباب پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ترقی پسندوں نے اشتراکیت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ وہ جاگتے سوتے اشتراکیت اور ترقی پسندی ہی کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اُن خوابوں کی تعبیر کی تلاش وجستجو میں مسلسل لگے رہتے تھے۔ دُنیا میں کوئی بھی انقلاب ایک دم نہیں لایا جاسکتا۔ صدیوں کی پرورش اور کوششوں کے بعد ہی کوئی مثبت انقلاب رونما ہوتا ہے۔ جس کے نتائج بھی دوررس ہوتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہوئے آن کی آن دنیا کے نظام کو بدلنا چاہا اُن کی شدّت پسندی اور انتہا پسندی ہی اس تحریک کے زوال کا اصل سبب بنی۔

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	ترقی پسند ادب، طبع۔۲	سردار جعفری	۱۷۔۲
۲۔	روشنائی	سجاد ظہیر	۸۷۔۸۶
۳۔	یادیں	سجاد ظہیر	۴۲
۴۔	ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ	ڈاکٹر صادق	۵۸
۵۔	سہ ماہی ''گفتگو'' بمبئی ترقی پسند ادب نمبر	علی سردار جعفری	۱۹
۶۔	''نیا ادب'' لکھنو خاص نمبر جنوری فروری ۱۹۴۱ء مشمولہ اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۳۷۰
۸۔	بحوالہ اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۳۷۰۔۷۱
۸۔	ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ	ڈاکٹر صادق	۷۲
۹۔	افادی ادب	اختر انصاری	۲۸
۱۰۔	نئے اور پرانے چراغ	آل احمد سرور	۳۷۷
۱۱۔	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۵۹
۱۲۔	ترقی پسند تحریک اور اُردو تنقید: ڈاکٹر شارب ردولوی بحوالہ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر	قمر رئیس / عاشور کاظمی	۵۴۹۔۵۰
۱۳۔	اردو میں ادبی تنقید کی صورتِ حال	آل احمد سرور	۹۶

۱۴۔ تنقیدی جائزے احتشام حسین ۱۳۳

۱۵۔ ترقی پسند تحریک اور اُردوناول ڈاکٹر قمر رئیس / قمر رئیس بحولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر عاشور کاظمی ۳۷۹

۱۶۔ اردوادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ منظر اعظمی ۳۷۷

۱۷۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمن اعظمی ۵۳

۱۸۔ ترقی پسند ادب سردار جعفری ۹۲

۱۹۔ ترقی پسند ادب سردار جعفری ۱۰۸

حلقہء اربابِ ذوق

ترقی پسند تحریک کے شانہ بہ شانہ ایک دوسری تحریک بھی چل رہی تھی جس کو اردو ادب میں حلقہء اربابِ ذوق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے تقریباً تین سال بعد اس تحریک کا وجود عمل میں آیا۔ اس کا نہ تو کوئی مینی فسٹو تھا اور نہ ہی اس کے اغراض و مقاصد طے کیے گئے تھے اس لیے اسے تحریک کے بجائے ایک ادبی رجحان کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ حلقہء اربابِ ذوق سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسند تحریک کا اثر قبول نہیں کیا اور ادب کو نعرہ بازی، وقتی ہنگامہ آرائیوں اور پروپیگنڈے سے دور رکھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس رجحان کا اثر بھی اس دور کے ادب پر دیکھا جا سکتا ہے۔

حلقہء اربابِ ذوق کی ابتداء ۱۹۳۹ء میں لاہور میں ایک ادبی مجلس کی صورت میں ہوئی تھی۔ جس کی بنیاد سیّد نصیر احمد جامعی نے ''مجلسِ داستان گویاں'' کے نام سے رکھی تھی۔ اس مجلس کے جلسے اس سے وابستہ افراد کے مکانوں پر ہوا کرتے تھے، شروع شروع میں ان جلسوں میں صرف داستانوں پر بحث و مباحثہ ہوا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ دوسری اصنافِ ادب پر بھی توجہ دی گئی اور بحث و مباحثہ کے دائرے کو وسیع کیا گیا اور اس کا نام بدل کر حلقہء اربابِ ذوق رکھا گیا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہء اربابِ ذوق کے تنقیدی نظریات اور طریقہء کار کے بنیادی فرق کو واضح کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں۔

> ''ترقی پسند تحریک اور اس کے ساتھ ترقی پسند تنقید ایک بنی بنائی تراشیدہ صورت میں قبول کی گئی۔ اُس کا طریقہء کار متعین اور مقصودِ نظر طے شدہ تھا وہ بات یا خیال کے باب ہی میں نہیں، اُس کی ترسیل اور ابلاغ کے معاملے میں

بھی ایک صاف شفاف ابہام اور تجرید سے مبرّا اسلوب اختیار کرنے کے حق میں تھی۔ دوسری طرف حلقہء اربابِ ذوق اور اس کے سائے میں پروان چڑھنے والی جدید تنقید اس لالہء خودرو کی طرح تھی جو آہستہ آہستہ نشو ونما پاتا ہے اور نشو ونما کے عمل میں ہمہ وقت موسموں کی تبدیلی سے اثرات بھی قبول کرتا جاتا ہے۔ گویا ترقی پسند تنقید ایک (Package) کے طور پر آئی جب کہ حلقہء اربابِ ذوق کی تنقید مزاجاً (Organic) تھی اور ایک پودے کی طرح آہستہ آہستہ اپنے پیکر کو تشکیل دیتی چلی گئی''۔[1]

ڈاکٹر ممتاز الحق نے حلقہء اربابِ ذوق کے متعلق لکھا ہے۔

''حلقہء اربابِ ذوق سے متاثر شعراء کے یہاں ابتدا سے ہی ایک طرح کی کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ نظریاتی جکڑ بندی نہ ہونے کی وجہ سے اُن شعراء کو اپنا انفرادی رنگ نمایاں کرنے کے مواقع زیادہ ملے اور جس طرح ترقی پسند ادب یکسانیت کا شکار ہوگیا حلقہ سے وابستہ شعراء کے یہاں وہ یکسانیت اور سپاٹ پن نہیں ہے''[2]

جب حلقہء اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پاس کوئی نظریاتی اساس نہیں تھی۔ حلقہ سے متعلق قلم کاروں نے خود کو مارکس کے نظریات سے آزاد رکھا اور بعد میں فرائڈ کے نظریات کو قبول کیا ترقی پسند ادیب جہاں ادب برائے زندگی کے قائل تھے وہیں حلقہء اربابِ ذوق نے ادب برائے ادب کے نظریے کو اہمیت دی۔ حلقہء اربابِ ذوق کے نقاد ادب کو ادبی معیاروں پر ہی جانچنا ضروری سمجھتے تھے انھوں نے ترقی پسندوں کے برعکس زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً روٹی، بدحالی، سماجی پستی، سیاسی غلامی کے بجائے تحلیلِ نفسی اور جنسی مسائل کو ادب کا موضوع بنایا۔ حلقے کے پاس ایسا کوئی بھی اعلان نامہ نہیں تھا جس میں ادب اور فن کے بارے میں کوئی واضح اور مخصوص نظریے کا اظہار کیا گیا ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند

کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی اس وقت کے انجمن کے سکریٹری کرشن چندر نے اس میں حلقہء اربابِ ذوق لاہور کے ادیبوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ کانفرنس میں حلقہ کی نمائندگی ن۔م۔راشد، میراجی، مولانا صلاح الدین احمد اور قیوم نظر وغیرہ نے کی تھی لیکن بعض انتہا پسند ترقی پسند ادیبوں کو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ جس کی اصل وجہ دونوں تحریکوں سے وابستہ ادیبوں کا نظریاتی اختلاف تھا ترقی پسند ادب کو آلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے جبکہ حلقہء اربابِ ذوق کے ادیب، ادب کو کسی غیر ادبی مقصد کا آلہ بنانے کے سخت خلاف تھے۔ اپنے قیام کے چند برسوں بعد حلقے نے ایسے تمام ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جو انسان دوستی، عالمی بھائی چارہ، امنِ عالم اور آزادی، وطن جیسے مسائل پر متفق ہوں۔ میراجی، ن۔م۔راشد، احمد ریاض اور صلاح الدین احمد جیسے نقادوں نے اس کو ایک تحریک کا رنگ دیا۔ لیکن یہ تمام نقاد مقصدی ادب کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے نزدیک:

> ''ادیب اپنے وقت کے مسائل و مصائب سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ مگر وہ لگے بندھے اصولوں کے تحت ادب پیدا نہیں کرتا۔ ادب میں احساسِ جمال زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔'' [۳]

اس سلسلے میں ن۔م۔راشد لکھتے ہیں:

> ''میرا یا میراجی کا مقصد کسی نظریہ کی تلقین کرنا نہ تھا بلکہ ہمارے نزدیک انسانی شخصیت کی داخلی ہم آہنگی ایک طبعی امر تھی اور اس کا ذکر ہم نے بغیر کسی ذہنی کشمکش یا فشار کے کیا ہے'' [۴]

اور میراجی اپنی نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''بعض پڑھنے والے جانتے ہوں گے کہ میری نظموں کا نمایاں پہلو انکی جنسی حیثیت ہے اور اس لیے بیشتر مجھے اسی نقطہء نظر سے گذرے ہوئے واقعات کو دیکھنا ہوگا'' [۵]

حلقہء اربابِ ذوق سے جڑے ہوئے قلم کار ادب کے لیے علامت پسندی اور

رمز و اشاریت کو ضروری خیال کرتے تھے وہ ادب میں سپاٹ پن سے گریز کرتے تھے اور اشارات و استعارات سے کام لیتے تھے۔ اُن کے نزدیک ادب کا اصل حُسن اُس کی اشاریت اور رمزیت میں پوشیدہ ہے بقول ڈاکٹر شمیم حنفی:

''انھوں نے علامتوں کے استعمال کو کثرت سے برتا، علامت و اشاراتِ خیال کی سب سے بڑھ کر اور آپ روپی صورت ہے اور دن اور رات کے خوابوں میں علامت، اشارات اور استعارہ کی زبان ایک ایسا بے ساختہ ذریعہ ءاظہار ہے جو احساسات پر کسی قسم کے بندھن نہیں ڈالتا''۔[۲]

حلقہ ءارباب کی دوسری شاخ دہلی میں ۱۹۴۱ء میں قائم کی گئی، یہ شاخ ضیاء جالندھری کے ایما پر قائم کی گئی جس کے ہفتہ واری جلسے اینگلو عربک کالج میں ہوا کرتے تھے۔ اس دوسری شاخ کے ارکان ضیا جالندھری کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی سکسینہ اور وقار عظیم تھے۔ لیکن چند سالوں بعد ہی سوائے ضیا جالندھری کے باقی تمام اراکین اس سے الگ ہو گئے۔ اس شاخ کے قیام اور اس میں شرکت کرنے والے حضرات کے بارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد رقمطراز ہیں کہ:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آئے۔ تو دہلی میں سب سے پہلے جو ادبی بزم جمی وہ پریم ناتھ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جوان دِنوں دلّی کالج میں پڑھاتے تھے پریم ناتھ در کے گہرے دوست تھے۔ پریم ناتھ در نے انکے ساتھ مل کے ''حلقہ ءارباب ذوق'' کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک طرح سے لاہور ہی کے حلقہ ءاربابِ ذوق کا تسلسل تھا۔ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اور پریم ناتھ کی کوششوں نے ہر ہفتہ'' حلقہ ءاربابِ ذوق'' کی محفل باقاعدگی سے دلّی کالج میں منعقد ہوتی تھی پریم ناتھ در اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے علاوہ ساحر لدھیانوی پرکاش پنڈت، مہدی عباس حسینی، شمیم

کرہانی، غلام احمد فرقت، سرسوتی شرن شرما، عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ ایسے
فنکار باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے'' ۷؎

مذکورہ بالا بیان کی تردید کرتے ہوئے منظر اعظمی رقمطراز ہیں کہ:

'' یہ بیان کسی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ورنہ اس وقت تک ترقی پسند حلقہء ارباب ذوق کے اراکین سے بیزار ہو چکے تھے اور اُن کی بڑھتی ہوئی انفرادیت ابہام اور جماعت بیزاری سے سخت نالاں ہو کر اسے خیر باد کہہ چکے تھے۔ اس لیے دلّی کے حلقے کی محفلوں میں انکی شرکت کسی اور سبب سے ہوگی۔ حلقے سے تعلق کی وجہ سے نہ ہوگی۔ دوسرے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دلّی کالج بھی تباہ ہوا۔ اور اس کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی پاکستان چلے گئے تھے۔ ایسے میں دلّی کالج میں ''حلقہء ارباب ذوق'' کی شاخ کا قیام شبہات سے پُر معلوم ہوتا ہے اصل سن ۱۹۴۱ء ہی معلوم ہوتا ہے'' ۸؎

مختصر یہ کہ اُردو کی تاریخ میں حلقہء ارباب ذوق کا قیام اور اس کی ادبی سرگرمیاں اہمیت کی حامل ہیں۔ حلقے نے نظم نگاری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے اور نظم میں نئے نئے تجربے کیے گئے آزاد نظم کو فروغ دینے میں ن۔م۔راشد اور میراجی کی کوششیں شامل ہیں۔ نفسیاتی تنقید کا آغاز بھی حلقے کے نقاد ریاض احمد کے ہاتھوں ہوا۔ ن۔م۔راشد، میراجی، ریاض احمد اور صلاح الدین احمد نے مسلسل تنقیدی مضامین لکھے۔

حلقے سے متعلقہ قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں بعض ایسے قلم کار بھی ہیں جو بیک وقت ترقی پسند تحریک اور حلقہء ارباب ذوق سے وابستہ رہے بغیر کسی امتیاز و تشخیص کے یہاں اُن ناموں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں حلقے سے وابستہ رہے۔ مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور، عبادت بریلوی، احسان دانش، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، راما نند ساگر، جگن ناتھ آزاد، ہنس راج رہبر، ظہیر کاشمیری، پرکاش پنڈت وغیرہ۔

ان کے علاوہ میراجی، ن۔م۔راشد، یوسف ظفر، قیوم نظر، تابش دہلوی، ضیا جالندھری، شہرت بخاری، صلاح الدین احمد، ریاض احمد، محمود نظامی، اعجاز بٹالوی، امجد الطاف، حفیظ ہوشیار پوری، مختار صدیقی، سعادت حسن منٹو، الطاف گوہر، شیر محمد اختر، آغا بابر، مبارک احمد حامد، عزیز مدنی، صلاح الدین اکبر، سید نصیر احمد، داؤد رہبر، انتظار حسین، ناصر کاظمی، وحید قریشی، وجیہ الدین، احمد محمد حسن عسکری، ابن سعید، عبدالمتین عارف، منیر نیازی، رحمٰن مذہب، سید قاسم محمود، انجم رومانی، شاد امرتسری مجید امجد اور محمد صفدر میر وغیرہ حلقے سے مستقل طور پر وابستہ رہے۔

ہندوستانی منقسم پنجاب کے بہت کم شاعر اس حلقے سے وابستہ رہے ہیں اور منقسم پنجاب کی غزل پر بھی اس کا اثر بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ ویسے بھی اس سے وابستہ شاعروں نے غزلیں کم نظمیں زیادہ لکھی ہیں اس لیے یہاں پر حلقہ ارباب ذوق کی مجموعی غزل کے نمائندہ اشعار ہی پیش کیے جا رہے ہیں۔

کتنے اقدار کے ایوان زمیں بوس ہوئے
آگہی راکھ کا اک ڈھیر ہوئی جاتی ہے؟

ضیا جالندھری

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

میراجی

کیا موت نے بھی سیکھ لیے دلبری کے ڈھنگ
یہ طرزِ بے رخی تو اس آرام جاں کے ہیں

قیوم نظر

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

حفیظ ہوشیار پوری

نہ پوچھ کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تیرے دل میں ہے اس بات پر نہیں آئے

حفیظؔ ہوشیار پوری

دل سے آتی ہے بات لب پہ حفیظؔ
بات دل میں کہاں سے آتی ہے

حفیظؔ ہوشیار پوری

اِن گالوں میں عکس ہے شفق کا
یا رنگ نظر میں گھل گیا ہے

اخترؔ ہوشیار پوری

رُکا جو کام تو دیوانگی ہی کام آئی
نہ کام آئے تو فرزانگی کو کیا کیجئے

ن۔م۔راشد

میں ہوں نا آشنائے وصل ہنوز
مجھ سے کیفِ وصالِ یار نہ پوچھ

ن۔م۔راشد

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	سہ ماہی حصار، رانچی	وزیر آغا	۴۱
۲۔	اُردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل	ڈاکٹر ممتاز الحق	۱۵۴
۳۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ	منظر اعظمی	۴۶۷

نمبر	حوالہ	مصنف	صفحہ
۴۔	سلیم احمد کے نام راشد کا ایک خط مشمولہ شعر و حکمت حیدر آباد ''راشد نمبر'' صفحہ ۳۲۷، بحوالہ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۳۲۷
۵۔	تحریر: میراجی مشمولہ سہ ماہی ''شعور'' دہلی مارچ ۱۹۷۸ء گوشہ میراجی	محمود ہاشمی	۳۵
۶۔	غزل کا نیا منظر نامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	۳۱
۷۔	''آنکھیں ترستیاں ہیں'' جگن ناتھ آزاد ۱۹۷۸ء صفحہ ۱۷۸ بحوالہ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۴۷۳
۸۔	اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۴۸۲

جدیدیت

ترقی پسند تحریک کے طلسم کا اثر ختم ہوا تو اِس کے بعد جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا۔ یہ رجحان انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی ادب کے زیرِ اثر اُردو ادب میں آیا۔ جدیدیت کی جڑیں حالّی اور آزاد کی جدید اور نیچرل شاعری سے جاملتی ہیں۔ سرسیّد کی علی گڑھ ادبی تحریک، انجمنِ پنجاب لاہور کے تحت ہونے والے مشاعروں کی جدید شاعری، رومانوی تحریک اور حلقہء اربابِ ذوق کی مجلسوں میں ہونے والی شاعری کا نکھرا اور سنورا ہوا روپ ہی جدیدیت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مذکورہ بالا تمام تر تحریکیں اور رجحانات کسی خاص مسلک اور نصب العین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اُن کی شاعری کی اصطلاحیں بھی مخصوص اور محدود تھیں۔ اسی لیے اصلاحی شاعری، قومی شاعری، ملی شاعری، رومانی شاعری، انقلابی شاعری، شبابیات کی شاعری، رِجائی شاعری، اجتماعی شاعری، عوامی شاعری اور ترقی پسند جیسی اصطلاحیں ہمارے سامنے آئیں۔ جدید شاعری ان تمام نظریاتی حدود و قیود سے آزاد رہی۔

خلیل الرحمن اعظمی نے جدید غزل کے حوالے سے لکھا ہے:

"جدید شاعروں کی ایک نسل ایسی پیدا ہو چلی ہے جو انکار و اثبات کے دوراہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہی ہے۔ یہ نسل جو نہ کافر ہے نہ مومن۔ زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر آن بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے۔ اس نسل نے مقررہ نظریوں، خانوں، فارمولوں اور نعروں سے اپنا دامن چھڑا لیا ہے اور کسی وقتی اور ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں

کیا ہے'' ١

نئی شاعری کے بارے میں منظر اعظمی لکھتے ہیں

''نئی شاعری تحریک نہیں ہے اس لیے کہ اس کا کوئی دستور العمل نہیں۔ کوئی قائد نہیں اور کوئی لگا بندھا نظریہ اور لائحہ کار بھی نہیں۔ یہ تو ایک ایسا ذہنی رویہ طرزِ احساس اور جدیدیت کی ایسی رو ہے جو کسی تقلید، کسی اصول اور ضابطے کی قائل نہیں۔ ایک آزادانہ احساس کا آزادانہ اظہار۔ انحراف و انقطاع کی ایک روش ہے جس کو جدید حسیّت (Modern Sensibilty) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا شدید احساس جس میں شکست و ریخت کا احساس اور عمل تیز تر ہے۔ مگر کچھ ایسی نئی قدروں کی تلاش کا بھی جذبہ ہے جو انسان کے باطن کے زنگ کو دور کر کے پھر سے اسے معصوم اور منزّہ بنا دے'' ٢

بقول رشید احمد صدیقی، اچھی غزل کہنے کے لیے شاعر کو ترکِ نصب کرنا پڑتا ہے اور اُسے اُس برادری میں شامل ہونا پڑتا ہے جِسے انسان کہتے ہیں۔ اُردو ادب میں جدیدیت کا اطلاق ۱۹۶۰ء کے بعد کی شاعری پر ہوتا ہے۔ یعنی جہاں پر ترقی پسند تحریک کا سفر ختم ہوتا ہے وہیں سے جدید شاعری کا آغاز ہوتا ہے اس دور کی شاعری میں ہمیں مندرجہ ذیل لفظیات اور نئی علامتیں ملتی ہیں، مثلاً دِن، رات، اندھیرا، اجالا، سورج، چاند، شام، سناٹا، تنہائی، چراغ، ہوا، دھوپ، آواز، گھر، دریچہ، کمرا، دروازہ، دستک، راستہ، سڑک، دھند، چہرا، شجر، سایا، پرچھائیں، درخت، پتا، ٹہنی، فصیل، حصار، سمندر، بادباں، جزیرہ، ابر، پتھر، خاک، ریت، پیاس، راکھ، صلیب، خنجر، آئینہ، آہٹ، صحرا، جگنو، پرندہ اور دشت وغیرہ۔

۱۹۶۰ء کے بعد پنجاب میں جو اُردو غزل لکھی گئی چند روایت پرست شعراء کو چھوڑ کر کم و بیش سبھی شاعروں کے ہاں جدیدیت کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ نئی شاعری کا آغاز ہوا تو ہندوستان بھر میں جدیدیت کے نام پر ایسے شعر بھی کہے گئے جن کا معنی و مفہوم قاری کو تو کیا خود شعراء کو بھی معلوم نہیں ہے۔ مثلاً

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دئے رات ہوگئی
پتھر کی بھوری اوٹ میں غنچہ کھلا تھا کل
آج اُس کو توڑلے گئیں دولڑکیاں جناب
بند کتابوں کے اندر تصویریں تھیں
بلّی رات کوچپکے سے سب پھاڑ گئی
چلنے لگے خلامیں ہواؤں کے نقش پا
سورج کاہاتھ شام کی گردن پہ جاپڑا

مہمل گوئی کی مثال یہ اشعار قاری کے لیے کسی بُھول بھلیّاں سے کم نہیں نو بہار صابر کے لفظوں میں شاعروں نے اس قسم کے اشعار کہہ کر جدید حسیّت اور نئی ہوشمندی کا مُنھ چڑایا ہے۔

جدید شاعری کے لیے شاعر کو شعری روایت کا صحیح عرفان اور ادراک ہونا بہت ضروری ہے۔ صحت مند روایت ہی سے صحت مند انحراف ہوتا ہے روایت کی صحیح سوُجھ بوجھ ہی جدیدیت کے لیے راہیں استوار کرتی ہے۔

''پنجاب کی جدید اردو غزل روایت کی ضد نہیں ہے بلکہ روایت میں نئے ابعاد کی جستجو کی مثبت سعی ہے۔ روایت سے مکمل طور پر انقطاع بھی ممکن نہیں ہے جیسا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے۔'' ہمارے حال کے اندر ماضی بھی نئے انداز میں ہمیشہ موجود رہتا ہے''[۳]

ماضی کی بنیاد پر ہی حال کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لیے کسی بھی شاعر وادیب کے لیے اپنے ماضی کو یکسر نظر انداز کر دینا ناممکن ہے۔ ہمارا حال ماضی ہی کے پیروں پر کھڑا ہے۔ انسان اپنے ماضی کے تجربات کی روشنی ہی میں حال سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کے منصوبے باندھتا ہے اور اپنے مستقبل کو بہتر سے بہتر اور خوشگوار بنانے کی کوشش

کرتا ہے۔ اس لیے ماضی ایک ناگزیر حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور اپنے ماضی سے روگردانی خودکشی کے مترادف ہے۔ اس حقیقت کو کُلّی طور پر سمجھ لینے کے بعد ہی ادب اپنے عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔

ادب اپنے عہد اور سماج کا آئینہ بھی ہوتا ہے اور اپنے عہد کے تمدّنی نشیب وفراز اور تہذیبی عروج وزوال کا آفریدہ بھی غزل کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے پہلے نئی غزل کے اُس عہد کو سمجھا جائے جس میں نئی غزل پروان چڑھی اور جس میں جدید غزل نے اپنا سفر طے کیا۔ نئی غزل کے تعلق سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہر وہ ادب جو اپنے عصری تقاضوں اور رجحانات کا پروردہ ہوتا ہے وہ کوئی رجحان یا تحریک تو ہوسکتی ہے لیکن جدید ادب نہیں اُردو ادب میں جدیدیت کا اطلاق بالخصوص ۱۹۶۰ء کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔

ن۔م۔راشد نے بجا کہا ہے کہ:

''جدیدیت کے معنی معاصرت نہیں ہیں۔ یعنی ہر وہ شاعر جو ہمارے عہد میں زندگی بسر کر رہا ہے اور شعر کہتا ہے جدید نہیں کہلا سکتا۔ جدیدیت ہر دور میں زندگی کی بدلتی قدروں پر ادبی اظہار کی معاصرانہ دسترس ہے''[۴]

آزاد گلاٹی کے لفظوں میں:

''جدیدیت دراصل ایک اضافی اصطلاح ہے۔ یعنی جو کل جدید تھا ضروری نہیں کہ وہ آج بھی جدید ہو اور جو آج جدید ہے، ہوسکتا ہے وہ کل جدید نہ رہے۔ روایت اور انقطاع یا توسیعِ روایت کے سلسلے میں جب ہم جدید غزل کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مُراد اُس غزل سے ہوتی ہے جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس سے لکھی جا رہی ہے کیوں کہ اس غزل میں چند ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنھوں نے اسے کلاسیکی غزل سے مختلف مزاج اور ذائقہ عطا کیا''[۵]

نئی غزل کی پہچان، ذات کا کرب، تنہائی، زندگی کی شکست و ریخت، اخلاقی

قدروں کا زوال، مشینی دور میں انسانیت کا فقدان ،خودغرضی ،احساس غیر محفوظیت ، مذہبی منافرت، انتشار، خوف و ہراس، بے چہرگی، ذات کی نا آسودگی، گھٹن ، بے یقینی، دردوکرب، بے گھری، غریب الوطنی، جڑوں سے کٹنے کا غم ،بے سروسامانی، سیاسی مکاریاں ،سماجی اور معاشی مسائل سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، انسان کی بے حُرمتی اور مذہبی عقیدوں کا کھوکھلا پن دوستوں کی بے مروتی اور اپنوں کی بے اعتنائی جیسے جذبات ہیں۔

جدید دور کا انسان ٹوٹتے بکھرتے رشتوں سے ذہنی اور روحانی سطح پر شدید کرب کا شکار ہے اور اپنے وجود کو دُنیا کی بھیڑ میں پانے کی کوشش میں غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہے آج کے انسان نے مادی اور سائنسی میدان میں حیرت انگیز کامیابی اور ترقی تو حاصل کرلی ہے لیکن اس ترقی اور کامیابی کا نتیجہ انسانیت کے زوال اور روحانی بے چینی کی صورت میں انسان کا مقدر بن گیا ہے۔

بقول آزاد گلاٹی:

”آج کا انسان سائنسی اور 'مادی کمال' اور اخلاقی اور روحانی زوال کے سنگم پر کھڑا ہے۔ سائنسی علوم میں اپنی برق رفتاری پیش رفت کی بدولت وہ پہلی بار کششِ ثقل سے آزاد ہوکر وسیع و بسیط کائنات کی لامحدودیت کے تصوّر سے پوری طرح آشنا ہوا ہے۔ گوزمین سے ابھی پوری طرح رشتہ منقطع نہیں ہوا۔ سائنس نے اُسے وہ جوہری طاقت بھی دی ہے جسے وہ اپنی بہبود کے لیے بھی استعمال کرسکتا ہے اور اپنی بربادی کے لیے بھی اور گذشتہ دو عالمی جنگوں نے ثابت کردیا ہے کہ وہ اس طاقت کو اپنی تباہی کے لیے استعمال کرکے اس زمین کو دوزخ بنانے کی احمقانہ جسارت بھی کرسکتا ہے۔ اس صدی کے پہلے نصف کی تاریخ انسان نے خود اپنے خون سے لکھی ہے اور آج کے انسان کے مقدر میں ایسی وراثت آئی ہے جسمیں انسانی اقدار کی توہین و تذلیل کے احساس

نے اسے اپنے بزرگوں کے لیے عزت واحترام سے بھی محروم کردیا ہے'' ۶

جہاں ایک طرف سائنس کی نئی نئی ایجادات نے اپنی برکات وثمرات سے انسان کو فیضیاب کیا اور تمام دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کردیا ہے وہیں انسان اس چھوٹے سے گاؤں میں خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔ مادی لحاظ سے تو انسان تمام دنیا سے جوڑ گیا لیکن روحانی اور جذباتی سطح پر وہ خود سے اور دنیا سے کٹ گیا ہے اور اس کی ذات میں ناختم ہونے والی تنہائی کا کرب سما گیا ہے ڈاکٹر زینت اللہ جاوید کے بقول:

''نئی تہذیب نے جہاں انسان کو بہت کچھ دیا ہے وہیں اس سے اس کا ماضی بھی چھین لیا ہے۔ کل تک اس کے قدم کم از کم زمین پر ٹکے ہوئے تھے لیکن آج آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنے کے باوجود وہ محسوس کر رہا ہے کہ کہیں ہوا میں معلق ہو کر تو نہیں رہ جائے گا ان خلاؤں کا سفر کہیں اسے روحانی خلاؤں میں تو مبتلا نہیں کر رہا ہے وہ خود اپنی لاش اٹھائے زندگی کی شاہراہوں پر کسی مدفن کی تلاش میں تو نہیں، کہیں اس کی سوچ وفکر کسی دوسرے کا آلہء کار تو نہیں؟ کہیں اس کے قدم کسی دوسرے کے اشارے پر تو نہیں اٹھتے۔ یہ لمحہء فکر یہ آج جدید انسان کو ایک ایسے کرب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں کہ اس کا جواب خود اس کے پاس بھی موجود نہیں وہ زندگی کے اس سفر میں بے بس ولاچار تنہا تنہا اپنا بوجھ اٹھائے بے مقصد بھٹک رہا ہے۔ دور سے چاند کی طرح روشن دِکھائی دینے والا یہ شخص اپنی ذات میں بے رنگ سا پتھر ہے جس کے مقدر میں کسی خلاباز کا نقشِ پا بھی نہیں'' ۷

نئی غزل میں انسان کی ذات کا ناختم ہونے والا کرب پیدا ہو گیا ہے جس نے انسان کو افسردگی اور بے حسی کے اندھے غار میں ڈال دیا ہے اور جدید انسان اپنی تمام تر کربنا کیوں اور ذہنی اذیتوں کے باوجود اس غار سے نکل نہیں پا رہا ہے۔ اختر اورینوی کا کہنا ہے کہ:

''جدیدیت کا بہترین میلان منفی افسردگی، حیات کش مایوسی، اجتماعی فلاح کی

کوششوں سے انحراف، زندگی کی ناقدری، جنسی بے راہ روی کی ہمت افزائی،
بے عملی کی تعلیم، خودکشی اور لاحاصل موت کی طرف سفر ہے“[۸]

جدیدیت کے نزدیک ادب انسان کے داخلی کرب کا اظہار ہے اور یہ کرب حالات کے جبر کا کرب ہے جدیدیت کے نزدیک صورتِ حال کو بدلنا ناممکن ہے۔ نئی غزل میں انسان کے اردگرد پھیلی تنہائی کے اذیت ناک کرب کا اظہار بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔

وہ خامشی ہے کہ سب سے ڈرا ہوا ہوں میں
پتہ نہیں کسے آواز دے رہا ہوں میں

بمل کرشن اشک

تھما کے ایک بکھرتا گلاب میرے ہاتھ
تماشہ دیکھ رہا ہے وہ میرے ڈرنے کا

باؔنی

ستارے ٹوٹ کے تاریکیاں بکھیر گئے
یہ حادثہ بھی سفر میں ہزار بار ہوا

کمار پاشی

دِشائیں چھو رہی ہیں آج مجھ کو
نکل کر خود سے باہر آگیا ہوں

کمار پاشی

اور کچھ دیر چمک غم کے دہکتے سورج
اور اِک سایہ بھی جسم کی دیوار میں ہے

ارماؔن شہابی

عجیب رنگ تھا اُس کی ذہین آنکھوں کا
وہ اِک نظر میں کئی بار پڑھ گیا مجھ کو

طلعؔت عرفانی

نگاہ ہم سفروں پر رکھو سرِ منزل
کہ مرحلہ ہے یہ اِک دوسرے سے ڈرنے کا

باقی

جاؤں میں کس طرف کہ کوئی مجھ سا ہو بہو
ہر سو کھڑا ہے میری راہ روک کر

کمار پاشی

ختم ہوا ہر خواب تماشا، راکھ ہوا ہر شہرِ صدا
دشت ہے ہر سو تنہائی کا ہوئے ہیں ہم بیدار کہاں

کمار پاشی

ہے دھوپ میرے سر پہ مگر تو بھی مری جاں
گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہے

گوپال متل

عالمی جنگوں سے ہونے والی تباہی، انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل اور بے حُرمتی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان حیوانوں سے بھی بدتر بن چکا ہے اور عالمی بھائی چارہ اور پڑوسیوں سے محبت کی بات قصہ، پارینہ بن کر رہ گئی ہے۔ انسان پر انسان کی بالا دستی اور قتل و غارت نے خدا کے تصوّر کو بھی جھٹلا دیا ہے۔ انسان نے اپنی تمام اخلاقی اقدار کو بھی اُتار پھینکا ہے۔ جو اُس کے اشرف المخلوقات ہونے پر دلالت کرتی تھیں۔ اس کو اس بات کا بھی احساس نہیں کہ ایٹمی طاقت کے احمقانہ استعمال سے روئے زمین پر اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں بچے گا۔ ایٹمی جنگوں سے پیدا ہونے والے خطرات اور مسائل کو پنجاب کے غزل گو شعراء نے بڑی شدّت سے محسوس کیا ہے۔

ایٹمی چھتری کے دیوانو! اسے تانے گا کون
وقت وہ آئے گا رہ جائیں گی خالی چھتریاں

شباب للت

کیا خبر ہے آپ کو اب ایٹمی جنگوں کے بعد
چاندنی شب دیکھنے کو بس خدا رہ جائے گا

کرشن ادیب

پرواز خلاؤں میں مبارک تمھیں لیکن
اِک بار بکھر کر تو یہ پیکر نہ ملے گا

ساحر ہوشیار پوری

زمیں بھی پاؤں نہیں رکھنے دیتی اب ہم کو
ہمیں یہ ضد تھی نیا آسماں بنائیں گے

کے۔کے۔رشی

نئی شاعری کے حوالے سے شمس الرحمان فاروقی کا کہنا ہے کہ:

''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں۔ جو ہمارے دور کے احساسِ جرم، خوف، تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی لہجہ سے اظہار کرتی ہے۔ جو جدید صنعتی اور مشینی اور میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن، اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے جدید گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیّوں کے خوف ناک احساسِ گم کردہ راہی سے عبارت ہے۔ نیا شاعر نہ ''ہاتھوں کا ترانہ'' لکھ سکتا ہے نہ ''طلوعِ اسلام'' اس کے پاس نہ اختر الایمان کی یادوں کا سہارا ہے نہ عبدالعزیز خالد کی سطحی علمیت زدہ مذہبیت اور دیومالائیت کا، نئے شاعر کے پاس صرف دو چیزیں ہیں۔ اس کی اپنی کچلی ہوئی تڑی مڑی مجروح شخصیت اور اس شخصیت کے زندہ، متحرک اور حساس ہونے اور رائے زنی (Comment) کرنے کا استحقاق رکھنے کا احساس لیکن یہ (Comment) کسی پلیٹ فارم، کسی خارجی دباؤ، کسی گروہ

یا بلاک کے مفاد و منفعت یا عناد و مخاصمت کے لیے نہیں۔ بلکہ خود اپنی شخصیت اور خارجی دنیا کے ٹکراؤ کے نتیجے میں اچھلنے والی چنگاریوں سے اٹھتا ہے۔ نیا شاعر شاعری کو صرف شاعری سمجھتا ہے۔ فلسفہ، پروگرام، مناظرہ، بحث وتمحیص، نصیحت، وصیت اشتہار یا اخبار نہیں۔ اگر یہ فن برائے فن ہے تو ہو رجعت پرستی ہے تو ہو لیکن نیا شاعر خود کو ہر طرح (Uncommented سمجھتا ہے۔ وہ نہ میمنہ میں ہے نہ میسرہ میں ہے۔ نہ سرخ ہے نہ سیاہ نہ سفید''۹

اس طرح نئی شاعری عصری حقائق کی بنیاد پر اپنے انفرادی جذبات و احساسات کو براہِ راست پیش کرنے کا نام ہے۔ نئی شاعری کسی منشور یا لائحہ عمل کی پابند نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر شمیم حنفی:

''جدیدیت عصریت نہیں ہے، بلکہ عصری سچائیوں کی بنیاد پر تاریخ اور تہذیب کے پورے سرمائے اور انسان کے ذہنی اور جذباتی مسائل کی دائم و قائم حقیقت کو نئے اور تازہ کار زاویوں سے دیکھتی اور دِکھاتی ہے۔ اس میں اظہار و افکار کی انقلاب آفریں تبدیلیوں کے باوجود نئی شاعری میں پیشرو شاعری کے کئی رنگوں کا طلسم کارفرما نظر آتا ہے اور ان مسائل و معاملات کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جو نئی شاعری کے آغاز سے پہلے بھی شعرا کی فکر و نظر کا مرکز بن چکے تھے''۱۰

منظر اعظمی لکھتے ہیں کہ:

''جب سائنس کی تیز رو ترقیوں نے مستحکم عقائد کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا تو شاعروں اور ادیبوں کے پاس ایسا کوئی عقیدہ نہ رہا جو اس کے پورے وجود کو کسی مقصد سے ہم کنار کر سکے اس لیے اسے کسی جماعت اور پیام سے دلچسپی نہ رہی۔ اس نے فلسفہ سیاست مذہب اور اخلاق کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ اور اپنے پہلوں کی طرح خدا کائنات اور حیات کے تکون

کو سمجھنے کے بجائے اپنی ذات کے عرفان کی کوششوں میں محو ہو گیا اور اس طرح
اس نے ادب کے ذریعہ اخلاق کی تلقین ۔ سیاست کی تبلیغ اور سماج سدھار کے
کاموں سے منہ موڑ لیا تو لازمی طور پر اس کے اپنے تجربے اور اس کا اپنا اظہار
خود اسکی ذات تک محدود ہو کے رہ گیا اور اس طرح اس میں خود کلامی کی کیفیت
پیدا ہوگئی اور اسے اس کی چنداں ضرورت نہ رہی کہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے
یا نہیں ہوتا ہمارے معاشرے کی گندگیاں ، فریب کاریاں اور منافقتوں نے
اسے اس سے برگشتہ کر دیا اور اسی برگشتگی میں اس نے مذہب ، سیاست ، سماج
اور ادب کے ہر فارمولے کو رد کر دیا ۔[۱۱]

جدید دور کا شاعر حساس ذہن لیکر پیدا ہوا ہے ۔ وہ دنیا کی ہر آن بدلتی قدروں اور مٹتی ہوئی روایتوں سے پریشان ہے ۔ وہ شہری زندگی کے دوغلے پن اور جدید انسان کے حیات کُش رویّہ سے خوف زدہ ہے ۔ اُس کی یہ خوف زدگی صرف شہروں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ گاؤں کے میلوں ٹھیلوں میں بھی خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے ان میلوں ٹھیلوں میں اُسے اپنے جیسے آدم زادوں کی بھیڑ تو دِکھائی دیتی ہے ۔ انسان ، انسانیت ، معصومیت ، پیار ، محبت ، شرم و حیا ، غیرت اور خلوص کہیں بھی نظر نہیں آتا جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ گاؤں کی زندگی اب شہروں کی زندگی سے زیادہ مختلف نہیں رہی ۔ گاؤں کی طرزِ معاشرت میں شہروں والا رنگ ڈھنگ اور طور طریقے آ گئے ہیں ۔ گاؤں کی زندگی میں بھی سادگی ، معصومیت بھولا پن ، بے نیازی ، بے لوثی اور خلوص کی جگہ شہروں والی مکّاری ، عیّاری ، فریب کاری ، خود غرضی ، موقع پرستی ، مطلب پرستی ، اور مادہ پرستی آ گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعر کو شہر اور گاؤں کی زندگی میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا ہے ۔ جدید دور کا شاعر زندگی سے مقابلتاً زیادہ بدحواس ضرور ہے لیکن اُس نے راہِ فرار اختیار نہیں کی ہے ۔ منظر اعظمی کے لفظوں میں :

"لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی شہری حقیقت بھی ختم ہو گئی ہے ۔ اور کوئی

سماجی زندگی نہیں صحیح نہ ہوگا۔ اصل میں ان کی نفسیاتی کیفیت صرف تخلیقی کرب کے لمحوں تک محدود رہتی ہے اور رہنا بھی چاہیے۔ اس لیے کہ اپنے زمانے کے دوغلے پن سے شاعروں اور ادیبوں سے بڑھ کر کون متاثر ہوسکتا ہے۔ یہی تاثر اسے اجنبیت کا احساس دِلاتا ہے۔ جس کا اظہار وہ کرتا ہے۔ مگر وہ جس ماحول میں رہ رہا ہے اس میں وہ زندگی اور شہریت کے تقاضوں سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ شاعر اور رِشی مُنی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ نئے طرزِ اظہار میں ابتدائی جوش وخروش کے سبب کچھ منفی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ چنانچہ لفظوں کو جوڑ جاڑ کر بھی نئی شاعری کی گئی اور نومبر پر دسمبر کو بری طرح گرایا گیا۔ مگر جب طوفان تھما تو فیشن اور فارمولے کی شاعری کرنے والے آہستہ آہستہ الگ ہوتے اور دبتے گئے۔ البتہ نئے طرزِ احساس اور نئے ذہن کی نمائندگی کرنے والے اچھے شعروں کی متاع لیکر آگے آئے اور آنکھیں بھی اندھیرے اجالے میں فرق کرنے لگیں۔ نئی شاعری پر جو اعتراضات کیے گئے وہ بیشتر اسی ابال والی شاعری یا کچھ تفریحی لمحات کی سستی آمد کے شعروں پر تھے اس لیے جب معترضین نے جوش وجذبے کی گرد سے نتھری اور دھلی ہوئی حقیقت کی صورت ابھرتے ہوئے دیکھی تو تنقید کے دستِ انصاف کا قلم سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ نئی شاعری نہ تو گردن زدنی ہی ہے اور نہ بے وقت کی راگنی ہی۔ نئی شاعری کے حوالے سے اردو زبان وادب نے خود کو وسیع کیا۔ توسیع کی اس کوشش میں بلاشبہ اس کے نازک جسم پر کچھ کھرونچیں بھی آئیں۔ بحیثیت مجموعی اس نے صرف مشینوں اور مشین نما شہروں اور موجودہ دور کے نظریوں کو اپنے میں جذب کیا ہے۔ بلکہ زبان نہ لہجہ اور ماحول کے اعتبار سے بیسویں صدی کے احساسات سے لبریز بھی ہے اور انحراف و انقطاع کے ساتھ ساتھ روایات کا احترام اور خوب سے خوب تر کی جستجو کے

عناصر بھی ہیں۔ سکہ بند اصولوں اور ضابطوں سے بغاوت کے ساتھ ساتھ
صحت مند تجربوں کی کوششیں بھی ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ادبی صحت اور
ترقی کے لیے استقبال کیا جا سکتا ہے۔ رد نہیں کیا جا سکتا''۔ ۱۲

''جدیدیت ایک وسیع اور کشادہ تحریک ہے۔ جس میں سماجی شعور
کے علاوہ روحانی ارتقا تہذیبی نکھار تخلیقی سطح بھی شامل ہے۔ جب کہ ترقی پسند
تحریک نے اس بڑی تحریک کے محض ایک خاص پہلو ''کل'' سے کاٹ کر الگ
کیا ہے اور ایک سیاسی مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی
ہے۔ لیکن چوں کہ ادبی مسلک، نظریاتی وابستگی کے تصور سے ملوث
ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے یہ تحریک اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں
ہو سکتی'' ۱۳

ڈاکٹر شمیم حنفی نے وزیر آغا کی اس بات کی کہ ''جدیدیت ایک وسیع اور کشادہ
تحریک ہے'' تردید کرتے ہوئے اپنی کتاب ''جدیدیت کی فلسفانہ اساس'' کے حرفِ آغاز
میں لکھا ہے کہ جدیدیت تحریک یا مکتبِ فکر نہیں ہے۔ کیوں کہ دونوں صورتوں میں کسی
موسس یا قائد کا وجود ایک شرط بن جاتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ''جدیدیت'' کی جو
تعریف کی ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی، اس کی اعصاب زدگی کی داستان
نہیں۔ اس میں انسانیت کی عظمت کے ترانے بھی ہیں۔ اس میں فرد اور سماج
کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسانی دوستی کا جذبہ بھی
ہے۔ مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بیزاری فرد پر توجہ اس
کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے
تصور سے خاص دلچسپی ہے۔ اس کے لیے اسے شعر و ادب کی پرانی روایت کو
بدلنا پڑا ہے۔ زبان کے رائج تصور سے نپٹنا پڑا ہے۔ اسے نیا رنگ و آہنگ

دینا پڑا ہے۔ اس کے اظہار کے لیے اسے علامتوں کا زیادہ سہارا لینا پڑا ہے۔''[14]

''اسی طرح جدیدیت (نئی شاعری) اپنے حالات کا تقاضا، اپنے تجربوں اور نئے افقوں کی تلاش، مغرب کے نئے افکار سے متاثر اور اجتماعی جبر یا ترقی پسندیدیت کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہونے والا ایسا قوی رجحان ہے جو پہاڑی ندیوں کی طرح اپنے بہاؤ میں اپنے کناروں کو بھی بہا لے گیا ہے۔ مگر اس سے زمینوں کی سیرابی اور اس کی زرخیزی میں اضافے کے فائدوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح نئے انسان کے خون میں اس کے اجداد کے خون کی گرمی بھی شامل رہتی ہے۔ مگر وہ دینِ بزرگاں کو خوش بھی نہیں کر پاتا۔ اور اس لیے مستقبل کے اشاریے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح نئی شاعری میں پہلے کی شعری روایات اور تجربوں کا رنگ بھی شامل ہے مگر وہ ان سے متاثر بھی ہے کیونکہ ہر لمحہ نئی سچائیوں سے متمائز کرتا جاتا ہے اور نئے تجربوں کی شمولیت ہر نئی سچائی کو نئے ابعاد سے ہم کنار کرتی جاتی ہے۔ بنیادی سچائیاں جوں کی توں قائم رہ جائیں تب بھی ان کی طرف رویّے تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں مستقل اور لازمی صداقتوں کو روحِ عصر کا استعارہ بناتی ہیں اور لمحاتی صداقتوں کو دائمی اور آفاقی معنویت سے ہم کنار کرتی ہیں۔''[15]

نئی شاعری کی فکری اساس سائنس اور ٹکنالوجی کی روز افزوں ترقیوں سے پیدا ہوئے خوف و ہراس، بے چہرگی اور انسانی شکست و ریخت پر رکھی گئی ہے اور نئے شاعر کی مثال اس شخص کی سی ہے جو زندگی کے چوراہے پر کھڑا وہاں سے گذرنے والے ہر شخص کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ چہروں کی اس بھیڑ میں اسے کوئی بھی شناسا نظر نہیں آتا جسے وہ اپنا کہہ سکے اپنے دل کا درد بتا سکے۔ لہٰذا وہ آبادیوں کے گھنے جنگل میں بھی خوف ناک تنہائی محسوس کرتا ہے اور اپنی ہی ذات کے اندھیروں میں گُم ہو جاتا ہے۔ نئی شاعری ہر طرح کی

سیاسی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے اور اس کا کوئی نصب العین بھی نہیں ہے اس لیے نئی شاعری کو ادبی تحریک نہیں کہا جا سکتا۔ بقول منظر اعظمی:

''نئی شاعری دراصل کوئی ایک میلان نہیں بلکہ مختلف میلانوں کا عطر مجموعہ ہے۔ جس میں بہت سے دھارے ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور کاٹتے گذرتے ہیں یہ میلانات اپنے پیچھے کچھ فکری بنیادیں بھی رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر آج کے معاشرے اور انسانی مسائل کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فکر ادعائیت، نظریاتی جبر اور سماجی سوچ کے برعکس نظریاتی وابستگی، آزادیء اظہار نئے تجربات، نئے طرزِ احساس اور علامتوں کے پیچیدہ استعمال کا ایک میلان ہے جس میں عصری صداقتیں اور فرد کے ساتھ حالات کا ظالمانہ رویّہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ نظریاتی سطح پر یہ ترقی پسندی کا مخالف اور فنی سطح پر تجربات اور ابہام کا قائل ہے۔ اس کے فکری عناصر اور خصوصیات کو اگر ایک جملے میں سمویا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اجتماع کے مقابلے میں فرد اور ادب میں آزادیء اظہار پر زور دینے کا نام ہے۔ فرد کی اہمیت اور ذات کی تلاش وجستجو یا عرفانِ ذات کی سعی وجد دراصل ۲۰ ویں صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقیوں اور اس سے پیدا شدہ خوف وہراس کے جذبے کا نتیجہ تھی۔ مشینوں کی تباہ کاری سے کچھ بعید نہیں کہ وہ خود اپنے خالقوں کو ہی کو تباہ کر دیں۔ مشینوں کی حکومت میں خود انسان بھی ایک حساس مشین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس طرح صنعتی معاشرے کا انسان اپنی بے وقعتی کا شدید احساس کرتا ہے۔ دوسری طرف جدید اسلحوں سے اجتماعی موت کا خوف اسے سماج کی معنویت کے احساس سے دور کر دیتا ہے۔ اس کی ذاتی انا اجتماعی انا سے متصادم ہوتی ہے۔ سیاست، سماج، مذہب، اخلاق، اصول اور ضابطوں پر اس کا اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے اور اس

طرح وہ ایسے چوراہے پر کھڑا ملتا ہے جہاں اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کدھر جانا ہے۔ بے یقینی کی اس کیفیت کو ایک جگہ میرا جی نے اس طرح بیان کیا ہے "نیا شاعر اب ایک ایسے چوک میں کھڑا ہے. جس سے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی راستے نکلتے ہیں۔ لیکن اسے پوری طرح معلوم ہے کہ کون سا راستہ اس نے طے کر لیا ہے۔ ماضی کے تجربے کیا اہمیت رکھتے ہیں کب تک اسے یوں ہی کھڑا رہنا ہے۔ حال کی اضطراری کیفیت کس حد تک اس کا ساتھ دے گی۔ اور کون سے راستے پر اس کو چلنا ہے۔ مستقبل کے خطرات اس کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں"۔ ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ "شہروں کے فاصلے مٹے، نئی تعلیم آئی، تعلیم اور تجارت کی آسانیوں نے نئے مقامات کی سیر کرائی اور گھریلو زندگی کا نقشہ مٹنے لگا۔ گھر سے دور ہو کر تنہائی کا احساس نشو و نما پانے لگا"۔ ۱۶

جدید شاعروں کے نزدیک اُن کے عہد کا انسان لاسمتی کا شکار ہے جو نہ تو صحیح راستے کا تعین کر پا رہا ہے اور نہ ہی اُسے اپنی منزل مقصود کا کچھ پتہ ہے وہ آسمان کی سیاہی اور زمین پر چھائے بے حسی اور لاتعلقی کے کُہرے کو تجسس آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بدلتے موسموں کی رنگینی، شادابی اور قدرت کے دلکش مناظر سے بے زار ہو کر خلا کی وسعتوں میں کھو گیا ہے۔ اُس کے دل میں نہ کوئی تمنا ہے اور نہ کوئی آرزو، نہ اُسے کسی کا انتظار کرنے میں لطف آتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کے وعدے پر اعتبار کرتا ہے اُس کو اپنا جسم کھوکھلا نظر آتا ہے. جس کی روح اِس مشینی عہد کے شور و غل اور بے ہنگم ماحول میں کب کی اپنا مسکن چھوڑ چکی ہے۔ گویا جدید انسان کو روح کا شراپ ملا ہوا ہے کہ جس پر دُعا، بددُعا کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مجھے زندگی کی دُعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تیری سادگی پر

گوپال متل

بیسویں صدی سائنسی اور سیاسی انقلابات، عالمی جنگوں اور تحریکات کی صدی ہے۔ گذشتہ صدیوں کے مقابلے یہ صدی سیاسی اور اقتصادی سطح پر زبردست اُتھل پتھل کا شکار رہی ہے۔ اور اس نے روئے زمین پر انسانی زندگی کے چہرے کو بُری طرح مسخ کر کے روحانی تعلیمات کو پائمال کیا ہے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے صحیح کہا ہے کہ:

''بیسویں صدی کے فلسفیانہ تصورات کا نشو ونما بیسویں صدی کے مخصوص سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ذہنی انقلابات کے پس منظر میں ہوا۔ سائنس اور سیاست نے استحصال اور استعمار کی جن قوتوں کو فروغ دیا اُن کی بازی گری کے نتیجے میں نئے انسان کے مسائل مادی اور روحانی ہر سطح پر پیچیدہ تر ہوتے گئے۔ جدیدیت کا فکری جواز مہیا کرنے والے تمام فلسفیانہ تصورات کی دیواریں انسانی مسائل کی اس پیچیدگی کی بنیادوں پر قائم ہیں'' ۔[۱۷]

''آج کے نئے شاعر کے عرفانِ ذات کی کوششوں، اس کے تنہائی کے احساس اور ہر نظریئے، عقیدے اور بندھے ٹکے اصولوں سے اس کی بیزاری میں وجودیت کے فلسفے کا بھی گہرا اثر ہے۔ وجودیت دراصل ایک ایسے تلخ تجربے کو راہ دیتی ہے جہاں کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ سوائے اس کے کہ وہ بے معنی ہے۔ وجودیت سارتر کے زیر اثر مکمل آزادی اور رہبری کرنے والے قوانین کی غیر موجودگی میں مکمل انفرادی ذمہ داری کو راہ دیتی ہے۔ مکمل ذمہ داری کا نتیجہ یا تو راہِ عمل اختیار کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ بن کر انسان کی روح پر سوار ہو جاتا ہے یا کسی غلط انتخاب کو راہ دیتا ہے جو ذمہ داری اختیار کرنے سے انکار کا بھی دوسرا نام ہے''۔[۱۸]

نئی شاعری نے ہر قسم کے زہد و تقویٰ کے لباس کو اتار پھینکا ہے اور صدیوں پرانی فرسودہ روایات کی زنجیروں کو بھی توڑ دیا ہے۔ نئی شاعری دِن رات انکار کے عمل سے گذر رہی ہے۔ اس کے نزدیک پرانی کتابوں اور معجزوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ

ہی اُسے مردہ نسلوں کی تاریک قبروں سے کوئی مطلب ہے۔تنہائی اور دنیا سے لاتعلقی کا اظہار نئی اردو غزل میں بھی ہوا ہے نئی اردو غزل میں ہمیں افراد کے ذہنی رویوں اور افسردگی و مایوسی کی ایک ایسی سنگین فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔جس کی مثال تاریخِ ادب کے کسی دور میں بھی نہیں ملتی۔نئی غزل کے غالب ترین رجحان کے بارے میں بشیر بدر نے لکھا ہے کہ:

"انسان زندگی دنیا اور تمام رشتوں ناطوں سے مایوس ہو رہا ہے۔اسے شدید تنہائی کا احساس ہے۔دنیا فرد کی پرواہ نہیں کرتی،فرد دنیا کی اہمیت سے منکر ہے انسان کی بڑھتی ہوئی انفرادی انا زمانے کی تیز رفتار تبدیلیاں،معاشرے کے تضادات سے بھری مصنوعی تہذیب طبقاتی بغض کسی مشترکہ مسئلہ کی عدم موجودگی اقدار کی شکست فسادات،جنگ،قتل و غارت گری،اسے شدید تنہائی اور مایوسی میں مبتلا کرتی ہیں۔زندگی کی بے کیفی، بے حسی، رومانی زندگی کی ناکامی،سفر کی بے سمتی،روح کی بے لباسی،وجود کی برہنگی،داخلی تفکر کرب واضطراب کا پہلو نمایاں ہے۔انسان کی اپنی بڑھتی ہوئی علمیت اسے کسی سے امید وابستہ نہیں کرنے دیتی ہے۔خود انسان خود غرضی،زمانہ سازی اور سمجھوتے بازی کے لیے مجبور ہے۔محبت پر اسے یقین نہیں ہے اس میں سفا کی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے جو خود اذیتی تک پہنچتا ہے۔خارجی دنیا سے مایوس ہو کر،مایوسی کرب اور ناامیدی میں انسان اپنی ذات کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اسے خود شکستہ،تنہا،خوف زدہ بے مایہ بے سہارا اور بے چہرہ ہونے کا احساس ہوتا ہے" [۱۹]

اس کے برعکس بشیر بدر نے ایک دوسری جگہ نئی غزل کے اُس مثبت رویّے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔جس میں فرد،زمانے کے مقابلے میں پُر امید اور پُر اعتماد نظر آتا ہے جس میں فرد کو زمانے سے شکایت تو ضرور ہے لیکن وہ کلی طور پر زمانے سے مایوس اور بدظن نہیں ہے۔

''انسان زندگی کی دنیا اور اس کے رشتوں سے پُر اُمید ہے۔ یہ نہیں کہ اسے سب خیریت کا دھوکہ ہو، اسے بے حسی، اُداسی، تنہائی، مایوسی کی خبر ہے۔ لیکن ان کیفیات کو بدلنے کا حوصلہ ہے، محبت، دوستی اور جنسی جذبوں کی سچائی پر اسے بھروسہ ہے، جوانی کی امنگ ہے، نیچر سے خوشگواری کے ساتھ متاثر ہونے کی صلاحیت ہے، ذات کے خول سے باہر آ کر دنیا کے سفر کا حوصلہ ہے۔ یہ سفر کہیں دلچسپ ہے اور کہیں داخلی مجبوری کا نتیجہ ہے۔ اپنے دشمنِ زمانہ حالات کے مقابلے میں خود پر بھروسہ ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عام طور پر غزل کے اچھے اور نمائندہ شعرا کے یہاں یہ دونوں رویے ملتے ہیں۔ ان دونوں رویوں کی ایسی ملی جلی کیفیت ملتی ہے کہ انھیں ایک خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ سکہ بند نظریاتی نقطۂ نظر سے یہ تضاد ہے لیکن یہ زندگی کی صحیح ترجمانی ہے۔ انسان نہ ہر دم اُداس رہ سکتا ہے اور نہ ہر دم مطمئین و مسرور، معاشرہ اگر بہت زیادہ صحت مند اور منصفانہ ہو اور فرد بھی خوش قسمت ہو، تب بھی دُکھ بیماری، حادثات اور موت کا اندیشہ بنیادی حقیقتیں ہیں۔ اسی طرح آج جیسے ابتر، یا اس سے بھی زیادہ بدتر زمانے میں بدقسمت سے بدقسمت انسان کے لیے کوئی لمحہ ایسا آ سکتا ہے جب وہ لمحاتی طور پر اپنے سارے دُکھ بھول جائے، مستقبل سے بے نیاز ہو جائے۔ اور حال کے لمحۂ موجود کی سرمستی میں ڈوب جائے۔ انسان میں اب بھی محبت اور دوستی کی صلاحیت ہے۔ جنس ہمیشہ سے زیادہ قوی تر اور ہیجان خیز ہے۔ قدرتی مناظر انسان کو ابھی خوشگوار طریقے پر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تصویر کے صرف ایک رُخ کا اظہار نظریہ سازی ہے''[۲۰]

جدید عہد کا انسان، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت پر کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زوردار قہقہہ جس میں چیخ چھپی ہوتی ہے

لگا کر رونے لگتا ہے یہ چیخ اور قہقہہ اُس کے آس پاس موجود اُن لوگوں سے پیدا شدہ خوف کا نتیجہ ہے جن سے مل کر بظاہر تو وہ خوش، مطمئین اور محفوظ نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر انہی لوگوں سے ڈرا ہوا ہے۔ اُسے اس بات کا بھی خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی شخص دوستی کی آڑ میں اس کا کام تمام نہ کر دے۔ اس خوف کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے بھی فاصلہ بنائے رکھتا ہے اور اُن سے پُر تکلف انداز میں دوری بنائے رکھنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے اور اس طرح جدید انسان گھر کے اندر اور باہر، دفتروں اور بازاروں، میلوں ٹھیلوں غرض زندگی کے ہر میدان میں سخت تنہائی کا شکار نظر آتا ہے یہ تنہائی اور ویرانی ہر جگہ اُس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ بقول بشیر بدر:

''اس مشینی معاشرے میں انسان ہر محاذ پر شکست کھا رہا ہے، یہی نہیں کہ اسے بازارِ دنیا میں ناکامی کا منہ دیکھنا ہو، سماجی، مادی اور معاشی ناکامی ہی گھریلو زندگی کی شدید ناکامی ہے۔ انسان دنیا میں بے عزّت ہو کر اپنے گھر میں عزّت حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ سڑک پر آوارہ پھرتے رہنے کے بعد تھک کر جب گھر جانے کی سوچتا ہے تو گھر کی ویرانی، گھر کے لوگوں کے مسائل، اس کی ذمہ داری اور اُن سے عہد بر آ نہ ہونے کے محدود وسائل گھر کے راستے کا دشتِ بلا بن جاتے ہیں۔ ایسا انسان بار بار یہی سوچتا ہے کہ زندگی کے کارزار کی تمام جنگ وجدل، تگ ودو لایعنی اور مہمل ہیں۔ اس کا زندگی پر سے اعتبار اُٹھتا نظر آتا ہے اور اسے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی مادی مسرتوں کو پانے کی آرزو بھاگتی دھوپ کو مٹھی میں قید کرنے کا عمل ہے اور جو اسے نہیں آتا۔

ان حالات میں ایسے انسان بھی ملتے ہیں جو محبت کا مفہوم بالکل نہیں سمجھتے۔ محبت کرنے اور اُسے نبھانے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔ پتھر انسان کے بدن کی طرح کیسے لچک سکتا ہے۔ اس عمل میں وہ بالآخر ٹوٹ جائے گا۔'' [۲۱]

نئی غزل کے مزاج کے بارے میں منظر اعظمی رقمطراز ہیں:

''نئی غزل کا مزاج اور اس کی زبان دراصل پچھلی دو دہائیوں میں پروان چڑھی۔ اس مدت میں زمانے کی تیز رفتاری نے بڑی الٹ پلٹ کر دی۔ اسی عرصے میں صنعتی تہذیب کی قیامتوں نے اس کے ذہنی اور جذباتی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا امید و یقین کے بجائے تشکیک، شبہات، نفرت، منافقت اور خود غرضیوں نے اسے اپنے سائے سے بھی ڈرا دیا۔ رشتے ناطے، تہذیب و تمدن، نیکی اور بدی کی ساری قدریں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں۔ اور نیا شاعر ایک شدید ذہنی بحران سے دوچار ہو کر اس طرح شعر کہنے لگا'' [۲۴]

مل گئے سارے عقائد خاک میں
پانیوں میں بہہ گیا سورج مرا

کمار پاشی

دنیا بھر کی تہذیبوں کا یہ کیسا انجام ہوا
ریت کے اونچے اونچے پربت ٹیڑھی میڑھی دیواریں

پریم کمار نظر

پھول سے چہروں کی شادابی کہاں رخصت ہوئی
خوف یہ کیسا، چھپا ہر روح کے پیکر میں ہے

خالد کفایت

خوف کے دشت میں احساسِ تحفظ کھو کر
آدمی ٹوٹتا جاتا ہے کہیں اندر سے

کرشن کمار طور

مجھے نکال تو دریائے بے یقینی سے
جواب کچھ بھی ہو لیکن اب اضطراب نہ دے

آزاد گلاٹی

۱۹۶۶ء تک کے مشترکہ پنجاب (جس میں ہریانہ اور ہماچل پردیش بھی شامل ہے) میں کہی جانے والی نئی اُردو غزل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے پنجاب کے شاعروں نے بھی ملکی فضا اور نئے شعری پس منظر میں عصری حسیّت کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنا ادبی کردار بحسن وخوبی نبھایا ہے اور اُن کی ادبی نفسیات اور تخلیقی صلاحیتیں نئی غزل کے ذریعے سے ہمارے سامنے آئی ہیں۔

منطق کی سولیوں پہ ہیں لٹکے ہوئے دماغ
ذہنوں میں اب خدا کا تصوّر نہیں رہا

ہیرانند سوز

کیا ہوا جو روشن ہے ذہن ابنِ آدم کا
کائناتِ دل میں تو آج بھی اندھیرا ہے

صابر ابوہری

جدید دور کا انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے اس قدر دہشت زدہ ہے کہ جب وہ تھکا ہارا شام کو اپنے گھر لوٹتا ہے تو اُسے نہ وہ گھر اپنا لگتا ہے اور نہ گھر میں رہنے والے لوگ ہی اُسے اپنے دِکھائی دیتے ہیں وہ ایک عجب سا خوف اور سناٹا محسوس کرتا ہے۔ اپنے گھر میں بھی غیر محفوظیت اور اپنے ہی گھر میں اجنبی ہونے کا احساس جدید انسان کا مقدر ہے وہ اپنے ہی گھر میں اس قدر سہا ہوا ہے کہ اُسے اپنا گھر آسیب کا گھر لگتا ہے۔ زمینی اور خونی رشتے بھی اُسے ناپائیدار اور بے معنی نظر آتے ہیں گھر کے تمام لوگوں کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور اپنی اپنی زندگی۔ سب اپنی اپنی لاش کو کاندھے پر اُٹھائے ہوئے زندگی کا سفر کاٹ رہے ہیں۔ بے حسی کا یہ عالم ہے کہ نہ خوشی میں شادماں ہوتے ہیں اور نہ غم میں غمگین۔

انسان نما پتھروں پر کسی کیفیت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔۔۔۔!

لوٹ کر گھر جائیں بھی تو کیا، وہاں اپنے لیے
خوف ہے دیوار و در کا اور تو کچھ بھی نہیں

کنور چوہان

کوئی جانے نہ پہچانے کسی کو
یہی اس شہر میں جینے کا ڈھب ہے

ضیا صدیقی

روشنی کو دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا کہیں
یاد رکھنا دوستو، گھر کے ہیں دشمن چراغ

ڈاکٹر نریش

یہ زمیں میری نہیں یہ آسماں میرا نہیں
جس میں رہتا ہوں میں وہ بھی مکاں میرا نہیں

بی۔ڈی۔کالیہ ہمدم

میرے اپنے جو میرے گھر کو جلانے آئے
تب کہیں جا کے مرے ہوش ٹھکانے آئے

مدھوکر آریہ

یہی بخشش ہے اس تہذیب نو کی
بشر اپنے ہی، گھر میں اجنبی ہے

ساحل

کھلے مکانوں میں رہنے کی عادتیں چھوڑو
سمٹ گئے ہیں یہاں لوگ، تنگ کمروں میں

مہر گیرا

کاش کشادہ دل بھی رکھتا
جس گھر کی دہلیز بڑی ہے

راجندر ناتھ رہبر

کھڑا باہر میں کب سے سُن رہا ہوں
خود اپنی سسکیاں دیوار و در سے

سردار پنچھی

شام ہوتے دھوپ سایوں سے لپٹ کر سوگئی
سب تھکے ماندے پرندے اپنے اپنے گھر گئے

عابد سنامی

غم کے سفر سے لوٹ کے پہنچا جب اپنے گھر
بانہوں میں لے کے رو پڑا میرا مکاں مجھے

پروین کمار اشک

لوگ سینے سے لگانے کی ادا بھول گئے
اپنے سائے سے لپٹ خون کے آنسو رو لے

زینت اللہ جاوید

آج کے اس مادہ پرست معاشرے میں رشتوں کو روپے پیسے کی میزان پر تولا جاتا ہے۔ جہاں پیسوں کی چمک دمک ہوتی ہے وہاں رشتے خود بہ خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ذاتی مفادات اور پیسے کی اس اندھی دوڑ میں خون کے رشتے بھی پانی ہو گئے ہیں اب مشترکہ خاندان کا بھی کوئی تصور نہیں رہا۔ خاندان کا ہر فرد مادی ضرورتوں اور حاجتوں کے پیش نظر اپنی الگ الگ زندگی گذار رہا ہے۔ مادی ضرورتوں سے پیدا شدہ مسائل نے اُسے خون اور خاندان کے رشتے سے بھی مُنکر کر دیا ہے اُس کے نزدیک سب سے اہم رشتہ پیسے کا ہے پیسے سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ رشتے بنائے جا سکتے ہیں اور اسے اس بات کا بھی

گہرا احساس ہے کہ یہ دنیا مطلبی ہے۔ یہاں مفلسی اور تنگ دستی میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔

دوسروں کے درد میں ہوتا نہیں کوئی شریک
اپنے مطلب کو نکل آتے ہیں صد ہا راستے

مہندر پرتاپ چاند

نظروں میں مرے ٹوٹتے رشتوں کا سماں ہے
امداد یہاں بھائی کو بھائی نہیں دیتا

شباب للت

اب دوست بھی پت جھڑ کے درختوں کی طرح ہیں
ان سے کوئی ٹھنڈک کوئی سایا نہیں ملتا

آزاد گلاٹی

محبت کی نہیں قیمت یہاں پر
سبھی زر کی عبادت کر رہے ہیں

کرشن پرویز

یہ حسرتوں کے میلے ناکام زندگی میں
کیسے مچا رہے ہیں کُہرام زندگی میں

پُنّو پرواز

ہائے بادل بھی بے وفا نکلے
بستیاں دیکھ کر برستے ہیں

مدھو کر آریہ

دوستوں کو دور، عارف لے گئے ذاتی مفاد
دوستی نیلام ہو جائے گی کیا معلوم تھا

گوردیال سنگھ عارف

کھلونے سے زیادہ تو نہیں وقعت غریب کی
کھلونوں کا مقدر ٹوٹنا ہے ٹوٹ جاتے ہیں

راجیش آنند اسیر

میں اکیلا ہی تھا بستی میں اندھیروں کے خلاف
گھر جلا میرا تو سب کو روشنی اچھی لگی

محمود عالم

ہم سے کسی نے شہر میں پوچھا نہ حال چال
چہرے پہ آشنائی کی کالک ملی تو تھی

سلطان انجم

رفتہ رفتہ خون کے رشتے ہوا ہو جائیں گے
آدمی کو آدمی پہچانتا رہ جائے گا

عبداللطیف تبسم

کبھی اوروں کے لیے اور کبھی خود کے لیے
زندہ رہنے کی سعی میں بھی بہانہ ہے شریک

افضال ملک

سوچ رہا ہوں کون اٹھائے گا اب گھر کی چھت کا بوجھ
سب کے اپنے کاندھے پر ہیں اپنی اپنی دیواریں

محمد رفیع

میں ٹوٹتے ہوئے رشتوں پہ سوگ وار نہیں
تمھیں نے ہاتھ بڑھایا تمھیں نے کھینچ لیا

ارمان شہابی

وہ خود سری ہے نئی نسل میں کہ بچوں کو
کسی طرح کی نصیحت کوئی نہیں کرتا

ہیرانند سوز

جگر مراد آبادی نے بہت پہلے کہا تھا کہ

جہل خرد نے دِن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

جگر کا یہ شعر جدید دور کی زندگی پر سو فیصد صادق اُترتا ہے۔ جس قدر آج کا انسان تنہائی کا مارا ہوا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ شہروں کی آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسان کا احساسِ تنہائی بھی بڑھتا جا رہا ہے بقول پروفیسر قمر رئیس:

''تنہائی آج کے انسان کا ذہنی مقدر ہے۔ جس نسبت سے شہروں کی بھیڑ بڑھ رہی ہے انسان کے ایک حساس ذہن کا احساسِ تنہائی پہلے وہ پُر رونق بازاروں اور پرچھائیوں کی طرح گذرتے ہوئے جلوسوں میں تنہا ہوتا تھا اب وہ گھر میں بھی تنہا ہوتا ہے۔'' ۲۳

پروفیسر آزاد گلاٹی کے لفظوں میں:

''تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو (Urbanisation) نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ آج کے صنعتی نظام میں شہر اپنی تمام مکروہات کے ساتھ بہت سرعت سے گاؤں کی طرف پھیل رہا ہے معاشی تگ و دو نے دوسروں، بلکہ خود اپنوں کے ساتھ رابطے کے سکون کے سارے وسائل مسدود و محدود کر دیے ہیں۔ آج کا انسان سورج طلوع ہونے سے پہلے (Rat Race) میں شامل ہو جاتا ہے اور سورج غروب ہونے کے بعد تھکا ماندہ گھر پلٹتا ہے تو اسے اپنے اہل و عیال سے رفاقتوں کے لمحے بھی گراں گذرتے ہیں۔ اس بے حسی کی وجہ سے وہ خود اپنے خول میں سمٹتا چلا جا رہا ہے''۲۴

دوستو یہ بھی کرشمہ ہے نئی تہذیب کا
گھٹ گئی انسانیت بڑھتی گئیں آبادیاں

آر۔ڈی۔شرما تاثیر

کِس طرح غم کھائیں دل فولاد میں ڈھالے ہوئے
کس طرح زخموں کو سہلائیں مشینی انگلیاں

بمل کرشن اشک

جس سے ملو وہ سوچ میں ڈوبا دِکھائی دے
ہر شخص انجمن میں اکیلا دِکھائی دے

نوبہار صابر

اے دوست اس قدر بھی اکیلا کوئی نہ ہو
میں خود بھی اپنے ساتھ نہیں دوسرا تو کیا

پریم وار برٹنی

اپنی روایتوں سے جو ٹوٹا تو دیکھنا
ہر شخص ہی ملے گا اکیلا کھڑا ہوا

ناز بھارتی

کم ہی سمجھ سکا ہمیں اپنی طرح کوئی
اکثر رہے ہیں آپ ہی اپنے قریب ہم

ظفر صدیقی

انسان کوئی ہو تو مرا درد جان لے
پتھر بنا کھڑا ہوں، خداؤں کے شہر میں

اسلم حبیب

شاید کِسی خلوص کا ردِعمل ہے یہ
ملنے لگے ہر ایک کو بیگانگی سے ہم

انوار آذر

نہیں تو شہر کو سناٹا کھا گیا ہوتا
کوئی پرندہ منڈیروں پہ بولتا تو رہا

مہیشؔ پٹیالوی

یہ کیسا وقت مجھ پر آ پڑا ہے
میں اپنے سائے سے ڈرنے لگا ہوں

کندن سنگھ اخترؔ

مجھے تھا وہم کہ دُکھ سُکھ میں کام آئے گا
مرا پڑوسی بھی نکلا ہے دوستوں کا سا

کرشن کمار طورؔ

روئی کچھ اور پھوٹ کے برسات کی گھٹا
جب آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے اُس کو ہم ملے

راجندر ناتھ رہبرؔ

عجب تنہائی ہے آئینہ رکھ کر سامنے اکثر
کیا کرتا ہوں پہروں گفتگو اپنے مقابل سے

کرشن پرویزؔ

محسن دیارِ غیر کو اپنا سمجھ کے ہم
کرتے ہیں اِک فریب سا اپنی خودی کے ساتھ

محسنؔ عثمانی

گھر سے نکلا تھا تو ہمراہ تھی حالات کی گرد
کون کہتا ہے ترے شہر میں تنہا گھومے

مسرورؔ لکھنوی

غیر آباد سا صدیوں سے پڑا ہو جیسے
سونا سونا مرا دل ہے اُسی گھر کی طرح

صابر ابوہری

ملاوہ ٹوٹ کے اور پُرتپاک تھا میں بھی
خلوصِ شوق نہ اُس کے نہ میرے پیار میں تھا

نوبہار صابر

جدید انسان کو اپنی جڑوں سے کٹ جانے کا غم بھی ہے اور خشک پتوں کی طرح ٹوٹ کر بکھر جانے کا خوف بھی اس کو اپنی کمزوری، بے بسی اور لاچاری کا بھی احساس ہے اس کے سامنے نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی جادہ آسمان پر کمندیں ڈالنے والا یہ انسان اپنے عہد کے اپنے ہی جیسے لوگوں سے خوف زدہ ہے۔ خود اپنی ہی نظروں میں اُس کا اپنا وجود ایک خشک اور ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح ہے۔ جسے یہ بھی خبر نہیں کہ وقت کی آندھی اُسے کب اور کہاں اُڑا کر لے جائے۔ لیکن اُسے اتنا ضرور معلوم ہے کہ بھٹکنا اور دربدر ہونا ہی اُس کا مقدر ہے۔

پیڑ کی جڑیں اکثر، پوچھتی ہیں دھرتی سے
اب ہماری شاخوں پر کون چچہاتا ہے

زاہد ابرول

خزاں کے دور کا حاصل ہیں ٹوٹتے رشتے
کھلیں گلاب وہ موسم ابھی سراب میں ہے

عزیز پریہار

کیا خبر ظالم ہوا مجھ کو کہاں لے جائے گی
شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی ہے منزل کہاں؟

شباب للت

ہرے پتوں کے گر جانے کا دُکھ ہے
ہوائیں پت جھڑوں میں رو رہی ہیں

ناشر نقوی

بن چُکا ہوں اب پُرانے موسموں کی یادگار
زندگی کی شاخ پر سوکھا ہوا پتا ہوں میں

خالد کفایت

ہم حصارِ ذات سے نکلے تو ہیں پر دیکھیے
ٹوٹ کر خود سے بکھرنا اب کہاں لے جائے گا

آزاد گلاٹی

مسرور میں بس آخری پتا ہوں شاخ پر
بڑھتا ہوا ہواؤں کا لشکر ہے سامنے

مسرور لکھنوی

حیران ہو رہا ہوں میں آئینہ دیکھ کر
اُڑتا ہوا سا کچھ ہے بکھرتا ہوا سا کچھ

شرون کمار ورما

بکھر چُکا ہوں کِتنا کِسے یہ کیا معلوم
کہاں کہاں میں نہیں ہوں کہاں کہاں ہوں میں

مہر گیرا

ظلمت نے اُس مقام پہ پہنچا دیا جہاں
آواز کے چراغ سے رستہ دِکھائی دے

تمنا لدھیانوی

زمانے کی ناقدری، انسان کی بے حرمتی، استحصال، مطلب پرستی، خودغرضی،

فریب وریا کاری، شخصیت کا دوغلہ پن، جیسے رویوں نے جدید انسان کو خارجی زندگی سے کاٹ کر رکھ دیا اور وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کر رہ گیا بقول آزاد گلاٹی:

''آج انسان کے لیے اپنے خارجی ماحول سے بالکل کٹ کر اپنے باطن میں جھانکنے کے علاوہ اور کوئی راہِ سکون نہیں رہی۔ ذات کی طرف اس مراجعت کا ایک سبب پَل پَل بدلتی ہوئی عالمی صورتحال ہے۔ بقول حامدی کاشمیری ''عالمی سطح پر تیز تر رفتار تبدیلیوں کے تحت انسان مجلسی اور اجتماعی نظریوں اور عقیدوں سے منحرف ہو کر ذات میں گم ہو گیا ہے''۔ اپنے باطن کی سیاحت میں اس کی ملاقات اپنے وجود ہی میں ایک ایسے شخص سے بھی ہوتی ہے جسے وزیر آغا (The other) یا دوسری ہستی کہتے ہیں۔ اس کی پہلی شخصیت جو تہذیب اور معاشرے کی عطا کردہ ہے۔ اس کا اجتماعی رُخ پیش کرتی ہے۔ اور دوسری اس کی اندرونی شخصیت، اس کی اپنی ذات ہے۔ ان دو شخصیتوں کے مسلسل تصادم سے جو احساساتی ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اس کا اظہار جدید غزل کا ایک نمایاں رُجحان ہے''[۲۵]

روبرو آیا تو میری روح تک تھرا گئی
چھپ کے بیٹھا تھا یہ چہرہ جسم کے اندر کہاں

ساحر ہوشیار پوری

جسم کی قید میں گھٹن ہے بہت
ڈھونڈ کوئی نیا مکان میاں

پریم وار برٹنی

جسم آسیب زدہ گھر ہے کہ جس میں اکثر
روح کا بھوت ہر شام ڈراتا ہے مجھے

پریم کمار نظر

اپنے دُکھ میں ڈوب کر وسعت ملی کیسی ہمیں
ہیں زمیں سے آسماں تک ہم ہی ہم پھیلے ہوئے

آزادؔ گلاٹی

ہے اپنے آپ میں سمٹا ہوا ہر شخص دنیا میں
کوئی کھل کو نہیں ملتا، کوئی ہنس کر نہیں ملتا

کرشن پرویزؔ

آرزو، ختم ہوئی ، کوئی تمنا نہ رہی
ہم جو منزل پہ چلے آئے بڑی بھول ہوئی

طالبؔ شملوی

اے زیست تجھے میں بھی اگر بھول چکا ہوں
تو بھی تو مجھے رکھ کے کہیں بھول گئی ہے

اجیت سنگھ حسرتؔ

کوئی جگنو بھٹکتا آ گیا تو آ گیا ورنہ
چراغِ قبر بن کر ہم اکیلے ہی جلے برسوں

سردار پنچھیؔ

دل میں آہٹ نہ کوئی ہلچل ہے
راہ ویران کوئی ہو جیسے

پونم کوثرؔ

کتنے ہی دِن سے ہو نہ سکی خود سے بات بھی
زار و نزار یوں بھی ملی زندگی مجھے

مشتاقؔ وارثی

تیرا احساس علامت ہے تیرے جینے کی
تو کبھی خود سے ہوا دور تو مر جائے گا

سدرشن کنول

زندگی، اے زندگی، آ دو گھڑی مل کر رہیں
تجھ سے میرا عمر بھر کا تو کوئی جھگڑا نہ تھا

آزاد گلاٹی

جدید تہذیب نے انسانی اقدار کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ جدید دور کا انسان اپنے دوستو سے ملتے وقت تکلف سے کام لیتا ہے۔ شاید یہ اس وجہ سے بھی ہے کہ آج کا انسان اپنے جیسے دوسروں لوگوں سے خوف کھانے لگا ہے اُس کو یہ بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی شخص یا اُس کا کوئی واقف کار ہی بیچ بازار اُس کو بے آبرو نہ کر دے۔ جدید انسان نے اقتصادی لحاظ سے اگر چہ کافی ترقی اور کامیابی حاصل کر لی ہے لیکن خوش لباسی نے اُس سے اس کا کردار چھین لیا ہے۔ شہر میں رہنے والا یہ انسان خصلت کے لحاظ جنگلی معلوم ہوتا ہے جس کے رویے میں بھی حیوانیت جھلکتی ہے انسان نما یہ جانور اپنے ہی جیسے لوگوں کا خون پیتا ہے اور ہر طرح سے ان کا استحصال کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو سینکڑوں ہاتھ پتھر لیے اُس کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کوئی سادہ لوح انسان اِن تمام حالات و واقعات سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے تنِ تنہا اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے تو زمانہ اُس کے راستے میں رخنے ڈالنے لگتا ہے اور اُسے ڈرانے دھمکانے لگتا ہے ڈاکٹر زینت اللہ جاوید کے لفظوں میں:

”نئے دور کی تہذیب نے ہمیں کیا دیا، شہر کی بلند عمارتیں جن کے اندر انسانی حیات مرجھا گئی۔ گاؤں سے شہر کی طرف دوڑ جس نے فطری مناظر سے بے نیاز کر دیا۔ جدید نفسیاتی الجھنیں جس نے انسان سے اسکی ماضی کی یادوں کا سرمایہ چھین لیا۔ شب وروز کی مسلسل دوڑ دھوپ جس نے اس کے خط وخال سے جوانی کا رس نچوڑ لیا۔ زندگی کی تپتی دھوپ جس نے گھنیری شام کے

پُرفسوں سائے چھین لیے شہروں کی بڑھتی آبادی جس نے صحنِ چمن خاک میں ملا دیا۔ چمکتے دمکتے ملبوسات جنہوں نے اس کی روح کو اور عریاں کر دیا۔ چیختی دھاڑتی مشینوں اور ملوں کی آوازیں جن میں بانسری کی سریلی مدھ بھری آوازیں ڈوب گئیں۔ مصلحت اندیش دوست جنہوں نے دوستی محبت اور خلوص کا خون کر دیا۔ آسمان کی بلندیاں جنہوں نے انسانوں کے قدموں سے اس کی زمین چھین لی۔ بازاروں کی چمک دمک جس نے اُسے بے ایمانی کا پیسہ کمانا سکھایا۔ بدلتے بگڑتے فلسفوں کی یلغار جس نے اسے بے عقیدہ انسان بنا دیا، مادہ پرستی جس نے ایک بے روح جسم کو جنم دیا۔ تفریحِ طبع کے وہ مصنوعی اسباب جس نے اسے مختلف ذہنی اور جسمانی امراض میں مبتلا کر دیا۔ سڑکوں پر دوڑتی پھرتی سواریاں جنہوں نے اسے معزور بنا ڈالا۔ چہروں پر نت نئے رنگوں کے چڑھتے اترتے غلاف جنہوں نے اسے عدم تحفظ کا شکار بنا دیا۔ سماج کا غیر مساویانہ سلوک جس نے اسے تنہائی کے کرب میں مبتلا کر دیا اور انجام کار نئے دور کی ان برکتوں کے انبار تلے انسان دب کر رہ گیا''۲۶

اِک مسلسل شور کی زد میں ہے اب ذہنِ بشر
اس مشینی یگ میں آوازیں بھی پتھر ہو گئیں

شبابؔ للت

کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن
لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

شبابؔ للت

پھر رہا ہوں یوں ہجوم شہر میں سہما ہوا
جیسے میلے میں کوئی ماں باپ سے بچھڑا ہوا

نوبہارؔ صابر

کٹ گئی آزادؔ کس بیگانہ پن میں زندگی
کاش ہوتا شہر میں کوئی ہمارا آشنا

جگن ناتھ آزادؔ

جو بن رہی ہے عمارت ہے اس سمگلر کی
جو گر رہا ہے پرانا مکان میرا ہے

گوپال کرشن شفق

شہر میں جب کوئی آ جاتا ہے آئینہ بدست
پتھروں سے جھولیاں بھر کر نکل آتے ہیں لوگ

نو بہار صابرؔ

منزل کی جستجو میں اکیلا چلا تھا میں
دنیا کے حادثات مرے ساتھ ہو لیے

زارؔ علامی

بھٹک رہا ہوں میں بے سمت راستوں کی طرح
کسی بھی سمت کا ہو راستہ دکھا مجھ کو

آزادؔ گلاٹی

جو دانہ ڈھونڈنے نکلا تھا گھر سے
وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے

پروین کمار اشکؔ

سوزِ غم سے جل رہا ہے آدمی اس دور میں
کتنی مشکل ہوگئی ہے زندگی اس دور میں

ناظرؔ صحرائی

مری نظر میں ہے روشن چراغِ نورِ وفا
سیاہ شب کی مہکتی ہوئی سحر ہوں میں

سکھ دیوشرما رشکؔ

گو لاکھ خوش لباس ہے اس دور کا بشر
کردار کے لحاظ سے ننگا لگا مجھے

شفقؔ

کوئی کاش یہ راز ہم کو بتائے
کہ ڈرتا ہے کیوں آدمی، آدمی سے

سلیمؔ زبیری

دِلوں کے کرب کا آئینہ دار ہوتا ہے
وہ قہقہہ جو کبھی گونجتا ہے کمرے میں

راجندر ناتھ رہبرؔ

زلفِ حیات اور بکھرتی چلی گئی
پچھتا رہے ہیں گیسوئے دوراں سنوار کے

تمنا لدھیانوی

جس نے صحرا میں کہیں پھول کھلانا چاہے
اُس کو گلشن کا ہر اِک ناز اُٹھانا ہی پڑا

اشکؔ امرتسری

کیا فضا ہے، سانس لینے میں بھی دشواری لگے
چہرے پر ہر آدمی کے رقم بے زاری لگے

گوردیال سنگھ عارفؔ

دل پر ایسا زخم لگا ہے جس کا کوئی نام نہیں
پوچھے ہے جب حال کوئی تو اچھا کہنا پڑتا ہے

رمضان سعید

مدتوں سورج پہ نکتہ چینیاں کرتے رہے
تب کہیں جا کر یہ کالی رات پھیلائی گئی

رمضان سعید

صاف گوئی کا بھی کیا خوب نتیجہ نکلا
شہر کا شہر مرے خون کا پیاسا نکلا

انجم قادری

میرے شہر کی اندھی سڑکیں کب مجھ کو پہچانتی ہیں
اپنے گھر تک آپہنچا ہوں اسلم بس اندازے سے

اسلم حبیب

ہم شکستہ دِل ستمگر بن گئے
آئینے ٹوٹے تو خنجر بن گئے

زینت اللہ جاوید

جب مجھ سے تجھے کوئی شکایت نہ گلہ ہے
پھر کس لیے تو اِتنے تکلف سے ملا ہے

ڈاکٹر نریش

دورِ حاضر میں تو مشتاق غنیمت ہے یہی
آبرو اپنی کسی طور بچالی جائے

مشتاق وارثی

بکھر گئے وہ غم زندگی کی ظلمت میں
دِکھائے تھے جو کسی مہ جبیں نے خواب مجھے

ریاض خلجی

دورِ حاضر میں اب اقبالؔ
کس کو اپنا کہہ کے بلائیں

محمد اقبالؔ

ہر ایک سمت کڑی دھوپ کا وہ عالم تھا
بچھا کے ریت پہ اپنا ہی سایا سونا پڑا

تختؔ سنگھ

کوئی چہرہ نہ تھا اپنا شناسا
مقابل بھیڑ چہروں کی لگی تھی

آر۔ڈی۔شرما تاثیرؔ

اِس لوٹ مار میں مری آنکھوں کو چھوڑ دے
اتنا تو ہو کہ مجھ کو اندھیرا دکھائی دے

آر۔پی۔شوخؔ

اس بھری دنیا میں سو ڈھب کے خدا دیکھے ہیں
سوچتا ہوں کہ میں خود اپنا خدا ہو جاؤں

کشمیری لال ذاکرؔ

پنجاب کی نئی اردو غزل میں اضطراب پیدا کرنے والے جنسی جذبات و تجربات اور اُن کی تسکین کے نفسیاتی پہلوؤں کا اظہار بھی نہایت خوبصورت اور سلیقہ مند طریقے سے ہوا ہے۔ نئی غزل کا محبوب کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں ہے کہ جس کو چھونے سے جنت سے نکل جانے کی سزا ملے اور نہ ہی وہ روایتی محبوب کی طرح پردہ نشین ہے کہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کو عاشق بے تاب رہا کرتا تھا اور نہ ہی چلمن سے لگ کر بیٹھنے والا معاملا ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' نئی غزل کا محبوب نہ محل سراؤں میں رہتا ہے اور نہ شیش محلوں میں پل کر جوان ہوتا ہے کہ جو اپنے عاشق سے ملنے کے لیے دِن رات سرد آہیں بھرا کرتا تھا بلکہ وہ تو اِس نئے دور میں دفتروں، بازاروں، اسکولوں، کالجوں، ہوٹلوں، کلبوں غرض ہر جگہ

اپنے عاشق کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ اب اُس کی محبت پر کسی طرح کا کوئی پہرہ نہیں ہے وہ جب چاہے جنسِ مخالف سے مل بھی سکتا ہے اور وصل کی جنسی لذتوں سے لطف اندوز ہو کر اپنی جنسی خواہشات کی تسکین بھی کر سکتا ہے۔

بقول پروفیسر آزاد گلاٹی:

''جدید غزل میں بھی نئے عہد کے تقاضوں کے تحت عشق اور جنس کے پرانے اور تسلیم شدہ رویّے متزلزل ہوئے ہیں۔ معاشی ضرورتوں نے مرد اور عورت کو خلوت و جلوت میں ملاقاتوں کے پہلے سے کہیں زیادہ مواقع فراہم کیے ہیں۔ اخلاقی قدروں کے زوال، رشتوں کے احترام میں کمی، ضبطِ تولید کے آسان وسیلوں کی فراہمی، عورت کی معاشی آزادی اور اس آزادی کی تحریکوں نے عصمت، اخلاق اور بدنامی کے مروّجہ تصوّرات کو بدل دیا ہے۔ اُردو غزل میں پہلی بار عورت کی جنسی اور جسمانی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی اور نفسیاتی شخصیت کا بھرپور اعتراف ملتا ہے۔ بقول فضیل جعفری ''نئی غزل کا محبوب نہ تو معنچہ ہے نہ ہی طوائف اور نہ ہی کسی ایسے ظالم باپ کی بیٹی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے پہلے سماج میں انقلاب لانے کی ضرورت پڑے۔ نئی غزل کی محبوب، بلکہ محبوبائیں نئے زمانے کی وہ لڑکیاں ہیں جن کی محبت کی ایک ذہنی سطح بھی ہے۔ اس طرح نئی غزل کا عاشق روایتی غزل کے عاشق سے بہت مختلف ہے۔ وہ نہ تو رات دن نالہ و فریاد کر کے اپنے ہمسایوں کی نیند حرام کرتا ہے اور نہ ہی محبوب سے ملنے کے لیے کوچہ رقیب میں سر کے بل جاتا ہے۔ جدید غزل میں محبت اور معاملاتِ محبت نفسیاتی واردات ہیں

''جدید غزل کے عاشق و معشوق مثالی کردار نہیں ہیں بلکہ وہ اسی دور کے نارمل انسان ہیں جن کے لیے محبت اور مثالیت زندگی کا واحد مقصد نہیں ہے۔ ان کے جسم بھی ہیں اور ذہن بھی۔ وہ ایک دوسرے کی نفسیات سے بھی واقف ہیں اور مادّی زندگی میں ایک دوسرے کی مجبوریاں، ضرورتوں اور مصروفیات

سے بھی'' ۲۷

شب بھر وہ میرے جسم سے لگ کر پڑا رہا
میں اُس کے جسم سے بھی پرے دیکھتا رہا

آزاد گلاٹی

پھول کو دیکھ، شاخ کو چھولے
لُطف ہر چیز کا اُٹھا بابا

مہر گیرا

جسم کی سوکھی دھرتی پر
ہاتھ تیرا بادل جیسا

پروین کمار اشک

تمام عمر رہا اُس کو ابر کا احساس
نہ جانے کون سی رُت میں وہ شخص بھیگا تھا

مہر گیرا

تیرے ہونٹوں کو چھو دیکھوں تو کہیو
میرے ہونٹوں میں کیا ایسا نہیں ہے

بمل کرشن اشک

سینے کے دو توبہ شکن پیغام تو ہیں خاموش مگر
لمس بھرے لرزیدہ لب کی کچھ ہلچل بھی دیکھ ذرا

پریم وار برٹنی

کرتے ہو میری دیدہ دلیری پہ اعتراض
دیکھو بدن پہ اُس کے جو لکھی ہیں دعوتیں

شباب للت

جسم کا وحشی پرندہ خود سے اُلجھا رات بھر
اور اُس کے بال و پر کو تو نے سہلایا نہ تھا

کرشن ادیبؔ

بدن کی اوٹ سے تکنے لگا ہے
وہ اپنا ذائقہ چکھنے لگا ہے

پریم کمار نظرؔ

اِک جسم کا تقاضا اگر روح مان لے
ہونٹوں کی پھر ہے پیاس نہ آنکھوں کی پیاس ہے

سلیم زبیری

چھو آتشِ ہوس کو کبھی، اور موم کر
کیا ان ہتھیلیوں پہ ہے لکھا ہوا نہ دیکھ

کرشن کمار طورؔ

وہ جو آ نہیں پایا بات کچھ ہوئی ہوگی
پانو بندھ گئے ہوں گے نیند آ گئی ہوگی

بمل کرشن اشکؔ

خزاں رسیدہ مِلا ہے تو کیسا رنج و غم
مرے نصیب میں تازہ گلاب تھا بھی نہیں

روبینہ شبنمؔ

اِک لڑکی نے کیا خراب
ورنہ اشکؔ تو سادھو تھا!

پروین کمار اشکؔ

ساز اُس کے بدن کا چھوتے ہی
اشک غزلیں لگے سنانے ہاتھ!

پروین کمار اشک

آج کے اس بدلتے ہوئے دور میں عشق و محبت کے رویۂ ں میں بھی تبدیلی آئی ہے آج تصورِ عشق بدل گیا اب اس میں وہ پہلی سی پاکیزگی اور جانثاری نہیں رہی پاکیزگی اور روحانیت کی جگہ جنسی ہوس نے لے لی ہے۔ خلوص و سادگی کی جگہ خودغرضی اور تکلف آ گیا ہے۔ آج کے محبوب کی ایک سے زیادہ محبوبائیں ہوسکتی ہیں اور ایک عورت ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ عاشقوں کا دل بہلاسکتی ہے۔ اب ایک مرد کی مردانگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ ایک وقت میں کتنی لڑکیوں کو اپنی محبوبائیں بناسکتا اور ایک لڑکی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ کتنے لڑکوں کو اپنی مٹھی میں رکھ سکتی ہے عشق کے بدلتے ہوئے معیار اور اقدار نے وفا کا تصوّر ہی ختم کر دیا ہے۔ آج کا محبوب کسی ایک کے سہارے اپنی زندگی نہیں گذار سکتا بلکہ وہ اپنے پاس ایک ساتھ کئی متبادل رکھتا ہے یعنی یہاں بھی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ویٹینگ لسٹ (Waiting List) والا معاملا کارفرما ہے۔

ع تو نہیں تو اور' اور نہیں تو اور سہی

پروفیسر آزاد گلاٹی نے صحیح کہا ہے کہ:

''آج کے (Utilitarian) معاشرے کے ہر پہلو میں بے راہ روی اور خیانت کا بول بالا ہے اور اس کا اثر آج کے تصورِ عشق پر بھی پڑا ہے۔ بقول عمیق حنفی ''محبوبہ پر اب کوئی عاشق ریزرویشن سلپ نہیں لگا سکتا۔'' جنسی خودغرضیاں، دائمی رفاقتوں اور پاکیزگی کے تصور پر حاوی ہوگئی ہیں۔ زندگی کی طرح عشق میں بھی بلیک میلنگ عام ذہنی رویّہ ہے۔ اب جنسی جذبہ کی وقتی تشفی ہی سب کچھ ہے۔ بقول بشیر بدر ''اب محبت صرف اپنے میں جلنے دور بیٹھنے اور روحانی تہذیب کا نام نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد روح اور جسم کا مکمل اِتصال

چاہتے ہیں۔ یہ عورت اور مرد فرشتے نہیں ہیں۔ اپنے ساتھیوں سے دغا بھی کر سکتے ہیں اور دوسرے اور تیسرے پر جنسی نظر بھی رکھتے ہیں۔''۲۸

مجھ سے پہلے بھی کسی کو تو نے چاہا تھا مگر
میں ترے ہونٹوں پہ لکھا آخری قصہ نہ تھا

کرشن ادیب

کل کے پھول کی پتّی کب تک کالے کوٹ پہ ٹانکے پھریے
رنگ برنگے باغیچوں میں پنکھڑیوں کی کون کمی ہے

بمل کرشن اشک

بستر میں تیرے میرے سوا اور کون ہے
محسوس ہو رہا ہے کوئی تیسرا بدن

پریم کمار نظر

میں جس کی قربتوں میں جی لیا کرتا تھا وہ لڑکی
مری بے درد آنکھوں کو پرائی اچھی لگتی ہے

پروین کمار اشک

ندیدوں کی طرح کیا تک رہے ہو
پرائے ناریل ہیں توڑنا مت

شباب للت

وقتِ رخصت اسے عادت تھی اداکاری کی
اُس نے کالر پہ ترے پھول بھی ٹانکا ہوگا

مصوّر سبزواری

شروع شروع میں نئی غزل پر بہت الزام تراشیاں کی گئیں۔ سب سے زیادہ مخالف روایت پسندوں اور ترقی پسندوں کی طرف سے ہوئی۔ انھوں نے جدید غزل کو سرے ہی سے شاعری سے خارج کر دیا ان کا اعتراض تھا کہ نئی غزل اپنی ذات کے خول میں

اسیر ہے اور مایوسی اور بے بسی ولاچاری نے اسے بیمار ذہنوں کی شاعری بنادیا ہے پروفیسر آزاد گلاٹی نے جدید غزل پر لگائے گئے اس الزام کو اس طرح رد کیا ہے کہ:

''یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیوں کہ جدید غزل (Commitment) کی نہیں (Involvement) کی شاعری ہے جدید غزل میں ذات میں اسیر ہو کر رہ جانے کا رُجحان نہیں بلکہ ذات کے حوالے سے کائنات سے فرد کے رشتے و رابطے کی مختلف ابعاد کی دریافت و شناخت کا رُجحان ملتا ہے اور پھر کیا جدید غزل میں ملک کے اندر سیاسی و معاشی بُحران اور عالمی سطح پر خدشات وخطرات کے ردِ عمل میں شعر نہیں ملتے مثلاً:۲۹

بہت بیمار ہے یہ دور، لیکن یہ یقین بھی ہے
مسیحاؤں کو اپنے خود زمانے ڈھونڈ لیتے ہیں

کے۔ کے۔ رشی

مجھے یقین ہے منظر ضرور بدلے گا
ہر ایک سمت ہیں بادل مگر زیادہ نہیں

مہر گیرا

میں شجر پھر بھی لگاتا جاؤں گا یہ جان کر
جب ثمر آئے گا کوئی توڑ کر لے جائے گا

پروین کمار اشک

خود مجھے علم نہیں ٹوٹ چکا ہوں کتنا
زندگی تیرے لیے پھر بھی سنورنا چاہوں

انجم قادری

تھکن سے چور ابھی وہ رہِ عذاب میں ہے
نئے جہان کا منظر تو اس کے خواب میں ہے

عزیز پریہار

کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

ساحرؔ لدھیانوی

نئی غزل پر الزام لگانا کہ یہ ترسیل کے المیہ کا شکار ہے صحیح نہیں ہے۔ اگر غزل میں مکمل ابلاغ و ترسیل سے کام لیا جائے تو اُس کی شعریت مجروح ہو جائے گی۔ رمزیت اور اشاریت ہی غزل کی جان ہے رمزیت سے عاری غزل گوئی نعرہ یا اشتہار تو ہو سکتا ہے غزل نہیں۔ ویسے بھی سپاٹ لہجہ تقریر کا حصّہ ہے شاعری کا فن نہیں۔ پنجاب کی نئی غزل کے اجمالی جائزے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کے شعراء نے نئے دور کی تازہ ہواؤں کے لیے اپنے ذہن و دل کے دروازوں کو وا رکھا ہے اور بدلتے ہوئے ذہنی رویّوں کے ساتھ روایت کا پورا احترام کرتے ہوئے نئے رجحانوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ غزل میں پیش کیا ہے۔ پنجاب کی نئی اردو غزل میں منفی و مثبت دونوں طرح کے رویّے پائے جاتے ہیں۔ یعنی اُمید اور نا اُمیدی اور سُکھ، دُکھ کے دونوں پہلو اور ساتھ ہی ساتھ جنسی رویّوں کا اظہار بھی۔

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	جدیدیت اور ادب	خلیل الرحمن اعظمی	۲۵۱
۲۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ	منظر اعظمی	۵۴۳
۳۔	پنجاب، ہریانہ اور ہماچل میں جدید اُردو غزل: ایک جائزہ۔ بحوالہ ''اظہار''	آزاد گلاٹی	۴۳
۴۔	اظہار	آزاد گلاٹی	۴۴
۵۔	اظہار	آزاد گلاٹی	۴۴
۶۔	اردو غزل کے جدید رجحانات (تحقیقی مقالہ)	آزاد گلاٹی	۲

نمبر	ماخذ	مصنف	صفحہ
۷۔	شعری رویے	ڈاکٹر زینت اللہ جاوید	۱۱۴_۱۱۵
۸۔	فراق گورکھپوری سے ایک انٹرویو۔شمیم حنفی۔ کتاب نما، دسمبر ٦٦	شمیم حنفی	۲۲
۹۔	مشمولہ ''لفظ و معنی'' از شمس الرحمن فاروقی شب خون کتاب گھر آلہ آباد، بار اوّل اکتوبر ۱۹٦۸ء	شمس الرحمن فاروقی	۱۲٦_۲۷
۱۰۔	نئی شعری روایت	ڈاکٹر شمیم حنفی	۲۲_۲۳
۱۱۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۵۳٦
۱۲۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۵۳۹_۴۰
۱۳۔	جدیدیت کیا ہے؟ ڈاکٹر وزیر آغا بشمولہ ''سیپ'' کراچی ۱۹۷۷ء	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۷۲_۷۳
۱۴۔	ادب میں جدیدیت کا مفہوم' از آل احمد سرور بشمولہ ''جدیدیت اور ادب'' اگست ۱۹٦۹ء	خلیل الرحمن اعظمی	۹٦
۱۵۔	نئی شعری روایت	ڈاکٹر شمیم حنفی	۱۴
۱٦۔	نئی شاعری کی بنیادیں از میراجی مشمولہ ''سوغات'' جدید نظم نمبر صفحہ ٦۵_٦۳ بحوالہ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	۵۴۲_۴۳
۱۷۔	نئی شعری روایت	ڈاکٹر شمیم حنفی	۷۱

۱۸۔ مغرب میں جدیدیت کی روایت: شمس الرحمٰن فاروقی مشمولہ ''لفظ و معنی'' اکتوبر ۱۹۶۸ء — شمس الرحمٰن فاروقی — ۹۱ ۱۶۰

۱۹۔ آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ — بشیر بدر — ۲۴۶

۲۰۔ آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ — بشیر بدر — ۲۴۶۔۴۷

۲۱۔ آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ — بشیر بدر — ۲۵۲۔۵۳

۲۲۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ — منظر اعظمی — ۵۶۰۔۶۱

۲۳۔ معاصر اردو غزل — پروفیسر قمر رئیس — ۱۴۲

۲۴۔ اظہار — آزاد گلاٹی — ۴۵

۲۵۔ اظہار — آزاد گلاٹی — ۵۲۔۵۳

۲۶۔ شعری رویّے — ڈاکٹر زینت اللہ جاوید — ۱۱۶۔۱۷

۲۷۔ اظہار — آزاد گلاٹی — ۵۵

۲۸۔ اظہار — آزاد گلاٹی — ۵۶۔۵۷

۲۹۔ اظہار — آزاد گلاٹی — ۶۳

مابعد جدیدیت

جدیدیت کے بعد ایک نئی ادبی اصطلاح مابعد جدیدیت (Post Modernism) کے نام سے وضع کی گئی ہے۔ جس پر آج کل ادبی حلقوں، سیمیناروں اور رسائل و جرائد میں خوب بحث چھڑی ہوئی ہے۔ یہ اصطلاح بھی دوسری اصطلاحوں کی طرح مغربی ادب کی دین ہے۔ چوں کہ کائنات کی ہر چیز تغیر پذیر ہے اور ادب کا تعلق انسان کی ذات اور کائنات سے ہے اس لیے ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ایلیٹ نے کہا تھا کہ ہر دس پندرہ برس کے بعد شعر کی تعریف بدل جاتی ہے۔ ادب کوئی جامد اور ساکت شے نہیں ہے۔ یہ بھی وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش اسے کبھی ایک نقطۂ عروج پر ٹھہرنے نہیں دیتی۔ ادب اپنے عہد اور سماج کا آئینہ ہوتا ہے، سماج بدلتا ہے تو ادب بھی بدلتا ہے۔ وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ الفاظ و معنی بھی بدلتے ہیں۔ پرانی علامتوں کی جگہ نئی علامتیں استعمال ہونے لگتی ہیں اور یہی تغیر و تبدّل ادب کی بقاء اور احیاء کے لیے بے حد ضروری ہے۔

مابعد جدیدیت کا اطلاق ۱۹۸۰ء کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔ دراصل یہ جدیدیت کی توضیح و توسیع ہے۔ جس کو مابعد جدیدیت کا نام دے دیا گیا ہے۔ مابعد جدید غزل ، کلاسیکل، ترقی پسند اور جدید غزل سے الگ ہے لیکن ان تینوں کی بازگشت اس میں سنائی دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کسی بھی نصب العین یا آئیڈیالوجی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی ہے۔ یہ اجتماعیت اور انفرادیت دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ یہ مقامی اور ثقافتی اقدار کے ساتھ ساتھ آفاقی اقدار کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بعد جو فرق ہمیں ان دونوں میں نظر آتا ہے وہ یہ کہ

جدید غزل میں تنہائی، اکیلا پن، بے زاری، نا اُمیدی اور لاتعلقی تھی، اس کے برعکس مابعد جدید غزل میں رفاقت، ہم آہنگی، کائنات سے رابطہ اور ہمدردی، جب کہ جدید غزل میں تشکیک، خوف وہراس اور بے چہرگی تھی۔ مابعد جدید غزل میں ذات کی محدودیت کی جگہ کائنات کی لامحدودیت جلوہ گر ہے یعنی (Centerlisation) کی جگہ پر (Diversity) پر بڑا زور ہے۔ مابعد جدیدیت کے تعلق سے اگر اُردو کے نقادوں کی بات کی جائے تو مختلف الخیال آراء ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جدیدیت کے سب سے بڑے نقاد پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کے خیال میں ''مابعد جدیدیت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مسئلہ ہی نہیں درحقیقت مابعد جدیدیت تو ذہن اور احساس کی ایک صورتِ حال ہے'' مابعد جدیدیت اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ سچ ہر زمانے میں بدلتا رہتا ہے اور اس کی کوئی ایک مقررہ شکل نہیں ہے۔ دنیا کے اعتقادات میں تضادات اور اختلاف ہر جگہ کی مخصوص ثقافت و کلچر کی وجہ سے پائے جاتے ہیں اس لیے آپ کسی ایک سچائی کو تمام دنیا پر نہیں تھوپ سکتے۔ ہر جگہ کی حقیقتیں اور سچائیاں الگ الگ ہوتی ہیں اس لیے مابعد جدیدیت مرکزیت کی جگہ مقامیت پر زور دیتی ہے بقول وہاب اشرفی:

''سچائیاں بنی بنائی نہیں ہیں وضع کی جاتی ہیں، اسی طرح تمام فنونِ لطیفہ اپنی ثقافت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر فنِ لطیف کی مکانی و زمانی تاریخ ہے جو اپنی متعلقہ ثقافت سے الگ نہیں ہے نہ ہی اسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ شعروادب کا پس منظر بھی یہی ہے۔ اِن مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت ایک Complex صورت ہے جس نے روشن خیالی، آزادی، جنسی بلکہ زندگی کے بیشتر گوشوں کو نئے اور متنوع ڈسکورس سے ہمکنار کیا ہے''[1]

گوپی چند نارنگ اپنی کتاب ''ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں رقمطراز ہیں:

"مابعد جدیدیت کا تصور ابھی زیادہ واضح نہیں ہے اور اس میں اور پسِ ساختیات میں جو رشتہ ہے اس کے بارے میں معلومات عام نہیں۔ اکثر دونوں اصطلاحیں ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ البتہ اتنی بات صاف ہے کہ پسِ ساختیات تھیوری ہے جو فلسفہ قضایا سے بحث کرتی ہے جبکہ مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورتِ حال ہے یعنی جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویّے یا معاشرتی و ثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی جو کرائسس کا درجہ رکھتی ہے مثال کے طور پر کہہ سکتے ہیں (Post Modern Condition) مابعد جدید حالت لیکن پسِ ساختیاتی حالت نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا پسِ ساختیات کا زیادہ تعلق تھیوری سے ہے اور مابعد جدیدیت کا معاشرے کے مزاج اور کلچر کی صورتِ حال سے۔۔۔" [۲]

وہاب اشرفی کے لفظوں میں:

"مابعد جدیدیت کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ ادب کی آفاقی قدروں اور آفاقی اصولوں کی بجائے مقامی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی بازیافت بھی ہے کیوں کہ زندگی کا ہر معنی معاشرے اور ثقافت سے صورت پذیر ہوتا ہے ادھر افریقہ میں سیاہ فام شاعری کا فروغ، ہندوستان میں دلت لٹریچر کی فراوانی اور بیشتر زبانوں میں نسائی ادبی رویوں پر اصرار اسی مابعد جدیدیت صورتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے" [۳]

ڈاکٹر خورشید احمد اپنے مضمون "مابعد جدید غزل: اظہار کے چند پہلو" میں لکھتے ہیں کہ

"پچھلے دس پندرہ سال کے عرصے میں معاصر غزل کے کردار میں ایک واضح تبدیلی آئی ہے چنانچہ اسلوب، مواد اور خاص طور سے نقطۂ نظر میں تغیر اس کی ایک الگ شناخت قائم کرتا ہے اس مختلف قسم کی غزل کی بہترین نمائندگی

عرفانؔ صدیقی، اسعدؔ بدایونی، آشفتہؔ چنگیزی، فرحتؔ احساس، مہتابؔ حیدر نقوی اور شارقؔ کیفی کے اشعار سے ہوتی ہے۔ اگر ہم اس غزل کو کوئی نام دینا چاہیں تو بڑی حد تک اس کا مناسب نام ''مابعد جدید غزل ہوگا''۔ ''جب ان شعرا کو ترقی پسند پڑھتے ہیں تو انھیں لگتا ہے کہ یہ تو ہماری ہی جیسی باتیں کر رہے ہیں اور جب جدیدیت کے حامی پڑھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ یہ اُن سے مختلف کہاں ہیں؟ بہر کیف وابستگی کے حوالے سے یہ شاعر اپنی زمین اور معاشرے سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ مابعد جدید غزل میں جو معاشرہ موجود ہے اُسے بآسانی پہچانا جاسکتا ہے'' [۴]

دیویندر اِسر اپنی کتاب ''ادب کی آبرو'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اب مابعد جدیدیت کا زمانہ ہے مابعد جدیدیت عصرِ حاضر کی فکر، تہذیب اور جمالیات کی نشاندہی کرنے والی ایک ہمہ گیر اصطلاح ہے۔ جدیدیت کی طرح اس کے مفاہیم بھی مسلسل بدل رہے ہیں۔ اس میں تضادات کی کمی نہیں۔ لیکن پھر بھی اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارا عہد جدیدیت کے دور سے نکل کر مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ مابعد جدیدیت کے ہمہ جہت اور دور رس اثرات کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ فلم سے لے کر فیشن تک، ادب سے لے کر اشتہار تک اور کلچر سے لے کر کامکس تک، ہر شے اور علم، ۔۔۔۔ تاریخ، فلسفہ، معاشرہ، میڈیا، میڈونا زندگی کا ہر شعبہ، تصوّر، طرز اور پیکر اس کے دائرہ ءآ گہی میں شامل ہے'' [۵]

آگے چل کر دیویندر اِسر لکھتے ہیں کہ:

''مابعد جدیدیت، اثباتیت، انسان پرستی، صداقت، حقیقت، آفاقیت، انسانی فطرت اور فطری جنسی اعمال، عقلیت اور مابعد الطبیعات کی نفی کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ کوئی بھی، کچھ بھی مستند نہیں اور نہ ہی

مابعد جدیدیت کی یلغار سے محفوظ ہے۔ مابعد جدیدیت اِس بات پر زور دیتی ہے کہ انسانی تجربہ اپنی ماہیت میں نہ صرف نامکمل اور بکھرا ہوا ہے بلکہ مختلف اقدار اور اقتدار بھی بحران کا شکار ہو چکے ہیں۔ مابعد جدیدیت فن کی ادارہ بندی، میوزیم کاری اور اشرافیہ کے فنی تجربے کی ارفع تخلیقی نوعیت کے دعوے کے خلاف روزمرہ کی زندگی کے کثرتیاتی عمل کو ترجیح دیتی ہے۔ اسی لیے شاید اس پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ اعلیٰ فن پارے اور ''بازاری حسن'' میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی''۔[۶]

سائنس اور ٹکنالوجی نے جس طرح ہماری فکر کے زاویے کو بدلا ہے اور تمام پرانی اقدار کی نفی کی ہے اور روز بروز تمام دنیا پر اس کے جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد ایوب نے لکھا ہے کہ:

''سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ نے دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس عہد میں انسان نے جتنی ترقی کی ہے اسی قدر مسائل سے بھی دوچار ہوا ہے۔ روپے کی دوڑ، تشدد، عصبیت، رشوت خوری، بیوروکریسی اور شخصی اجارہ داری کے رجحان نے نئے فکری اور تہذیبی رویّوں کو جنم دیا ہے جس نے ادبی معیار بدلے ہیں اور ایک احتجاجی سوچ پیدا کی ہے اب وہ صرف ذات سے کائنات کا سفر نہیں کرتا بلکہ اپنے باہر کی دنیا کا بھی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ آٹھویں دہائی کے بعد نئی نسل کے شعراء نے اپنی نظموں میں احساسات کی شکست وریخت کے ساتھ ساتھ زندگی کے مثبت رویّوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت اور ابہام کے ساتھ صراحت کا بھی التزام کیا ہے''۔[۷]

پنجاب کی اُردو غزل نے جہاں ترقی پسندی اور جدیدیت کا اثر قبول کیا ہے وہیں ۱۹۸۰ء کے بعد کی پنجاب کی اُردو غزل پر مابعد جدیدیت کے اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے

جا سکتے ہیں شاعر و ادیب ہر چند یہ اعلان کرتے رہیں کہ انھوں نے کسی تحریک یا رجحان کا اثر قبول نہیں کیا ہے لیکن اُن کی تخلیقات اِس بات کی ضامن ہیں کہ شاعر دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو وہ ادب میں ہونے والی تبدیلیوں اور نئے رجحانات و میلانات سے ذہنی سطح پر کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتا رہتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد کی پنجاب کی غزل میں مابعد جدیدیت کے رویوں کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے۔ معاشرہ بد سے بدتر بھلے ہی ہو جائے۔ لاکھ مسائل در مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں۔ تعمیری رجحان پر تخریبی عمل بھلے ہی غالب آجائے۔ زندگی دشوار سے دشوار ترین ہو جائے لیکن پھر بھی ایک مخلص شاعر یا ادیب اپنی ادبی ذمہ داریوں سے عہد برآ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے مثبت سوچ اور تعمیری رویوں ہی کو فروغ دینے کی بات کرتا ہے وہ کبھی ناامیدی کے دشت میں نہیں بھٹکتا۔ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی جوئے شیر نکالنے کو حوصلہ رکھتا ہے۔ مخالف اور تیز و تند ہواؤں میں بھی محبتوں کے چراغ روشن کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ شر کو خیر میں بدلنے کا یہی رویہ پنجاب کی مابعد جدید غزل میں بھی موجود ہے۔

خودشناسی ایک ایسا عمل ہے جو بندے کو اپنے خدا سے ملا دیتا ہے۔ جب انسان خودشناسی کے مرحلے سے گذرتا ہے تو اُسے اپنے دل کے اندر کُل جہاں کی وسعتیں آباد نظر آتی ہیں۔ من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور خود اپنے پر محبوب کے ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ہر انسان میں اپنی ہی صورت نظر آنے لگتی ہے۔ ہر طرف الفت، محبت اور خلوص دِکھائی دیتا ہے لیکن خودشناسی کے اس عمل سے گذرنے سے پہلے اپنے دل سے جہالت کی گرد کو صاف کرنا پڑتا ہے تبھی اُس پر نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں ورنہ گرد آلودہ آئینے میں انسان کو اپنا تو کیا دوسروں کا عکس بھی دھندلا اور آلودہ دِکھائی دیتا ہے۔ بقولِ شاعر

جس آئینے کی گرد کوئی جھاڑتا نہیں
اُس آئینے میں چاند بھی میلا دِکھائی دے

الفت ملی، خلوص ملا، دوستی ملی
ہر دل میں ہم کو اپنی ہی تصویر سی ملی

ساحرؔ ہوشیار پوری

دلوں سے گردِ جہالت کو صاف کرتا ہے
گذرتا وقت نئے انکشاف کرتاہ ے

راجندر ناتھ رہبرؔ

نکل پڑے ہیں حفاظت کو چند کانٹے بھی
ہوا ہے جب سے گلوں کا نزول شاخوں پر

راجندر ناتھ رہبرؔ

پنجاب کی مابعد جدید غزل نہ تو غم سے گھبرا کر خودکشی کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور نہ قسمت پر بھروسہ کر کے بے عملی کا ایسا پیغام کہ آدمی سب کچھ بھلا کر آرام کی نیند سو جائے۔ بلکہ سوتے ہوئے بھی جاگتے رہنے کی ذمہ داری پیدا کرتی ہے اور اپنے اپنے گھروں کی فکر کرنے کے بجائے تمام شہر کو خطرات اور آفات سے بچانے کی بات کرتی ہے کیوں کہ جب کوئی مصیبت، طوفان یا سیلاب آتا ہے تو وہ دو چار گھروں کو نہیں، پوری بستی کو بہالے جاتا ہے۔ انھیں جذبات و احساسات کا اظہار بھی پنجاب کی مابعد جدید غزل میں خوب ہوا ہے۔

اپنے اپنے ہی گھروں کی فکر گر کرتے رہے
دیکھنا طوفان یہ سارا نگر لے جائے گا

تاثیرؔ

طوفان کی موجوں کو اتنی تو بلندی دے
کشتی سے مجھے یا رب ساحل نظر آئے

مترؔ نکودری

کہیں سے کیجئے آغازِ گفتگو لیکن
ذرا خیال رہے باوقار ہم بھی ہیں

محمود عالم

غم سے گھبرا کے خودکشی کرنا
بزدلی ہی کی تو علامت ہے

سردار پنچھی

اگر تقدیر پہ مجھ کو بھروسہ ہوگیا ہوتا
تو میں آرام سے سب کچھ بھلا کر سو گیا ہوتا

اشک امرتسری

کہیں بھی جائیں ہم گھر کو بھولتے ہی نہیں
ہمارے ساتھ ہمارا مکان چلتا ہے

وید دیوانہ

ہر گھڑی اپنے آلام کا تذکرہ
زیست کرنے کا یہ کوئی ڈھب تو نہیں

شباب للت

پھر ہری شاخ نکل آئی ہے جاوید اس میں
جڑ ہری ہو تو شجر ختم کہاں ہوتا ہے

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

یہ بھی مابعد جدید غزل کے مثبت رویے ہی کا اثر ہے کہ پنجاب کا شاعر آفتاب ڈھلنے کا ملال نہیں کرتا۔ اُسے معلوم ہے کہ چراغ کی قدر سورج غروب ہونے کے بعد ہی کی جاتی ہے اور آفتاب ڈھلنے کے بعد ہی چراغوں کے جلنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ اندھیرا جیسے جیسے بڑھتا جائے گا اور رات جیسے جیسے کالی ہوتی جائے گی۔ ویسے ویسے ہی چراغ کی روشنی بھی بڑھتی جائے گی۔ رات کتنی ہی اندھیری کیوں نہ ہو چراغ

کا مسلک جلنا اور روشنی لٹانا ہے۔ چراغ علامت ہے نیکی، خوشی اور روشنی کی اور آفتاب کا ڈھلنا علامت ہے مصیبت، بدی، غم اور اندھیرے کی پنجاب کا شاعر ناامیدی میں بھی امید کا پہلو نکالنے کا عزم جواں رکھتا ہے''گھر'' بظاہر ایک چھوٹا سا دوحرفی لفظ ہے لیکن اس کی معنویت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے جن کی زندگی سفر میں گذری ہو۔ جنھوں نے سفر کی صعوبتیں برداشت کی ہوں۔ سفر کے خطرات کو جھیلا ہو اور سفر در سفر کرتے ہوئے گھر کے آرام وسکون سے محروم رہے ہوں۔ ایک لمبے سفر سے لوٹ کر ہی انسان کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گھر کسے کہتے ہیں اور اپنا گھر کیا ہوتا ہے؟ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان گھر میں رہ کر بھی گھر کو ترستا ہے۔ آج کے انسان کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ذرا سی بات پر ہی ترکِ تعلقات کر لیتا ہے۔ لیکن جب اُسے اپنے کیے پر شرمندگی ہوتی ہے اور وہ دوبارہ تعلقات استوار کرنا بھی چاہتا ہے لیکن اُس کی انا درمیان میں حائل ہو جاتی ہے۔ اور وہیں دوسری طرف اُس کو یہ بھی خدشہ رہتا ہے کہ وہ تعلقات تو استوار کرلے مگر کیا پتہ سامنے والا اپنے مقفل دل کا دروازہ کھولے گا بھی یا نہیں۔ زندگی کے تمام سرد وگرم سے گذرنے اور ہر نشیب وفراز کو جھیلنے کے بعد جب انسان زندگی کے آخری پڑاؤ میں قدم رکھتا ہے تو اُس کی زندگی سے زرخیزی اور شادابی کا موسم ختم ہو چکا ہوتا ہے باقی بچتا ہے تو صرف خُشکیوں کا موسم۔ زندگی کے تمام دریا اُتر جانے کے بعد جب خُشکیوں کا موسم شروع ہوتا ہے تو ہر انسان کو اُسے اکیلے ہی طے کرنا پڑتا ہے۔

ملال کیجیے کیا آفتاب ڈھلنے کا
یہی تو وقت ہے اپنے چراغ جلنے کا

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

روح بن کر ترے پیکر میں سما جاؤں گا
جب مرا جسم مجھے حکمِ رہائی دے گا

انجم قادری

سفر سے لوٹ کر آئے تو اندازہ ہوا آذر
سفر آخر سفر ہے اور گھر ہوتا ہے گھر آخر

انوار آذر

کبھی دستک جو دی ہوتی تو کھلتا!
درِ دل پر کہیں تالا پڑا ہے؟

رمضان سعید

بس اب تو اگلا سفر خشکیوں کا آتا ہے
ہماری راہ کے دریا اُترتے جاتے ہیں

پریم کمار نظر

پنجاب کا شاعر نہ تو بُت شکن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور نہ بُت پرستی کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد تو انسان اور انسانیت سے محبت کرنا ہے۔ وہ خداؤں کے شہر میں ایسے انسان کی تلاش میں مصروف ہے جو اُس کے دِل کا درد جان لے۔ اور جب وہ آدابِ خرد سیکھ لینے کی بات قبول کرلیتا ہے تو زمانے سے یہ بھی التجا کرتا ہے کہ اب اُس نے جنوں کو ترک کر کے آدابِ خرد کا راستہ اختیار کرلیا ہے۔ چاہے اُس نے یہ قدم کسی مصلحت کے تحت ہی کیوں نہ اٹھایا ہو۔ راہ میں لُٹ کر بھی سفر کا حوصلہ' کئی بار جڑوں سے کٹنے پر بھی برگ وثمر دیکھنا، دُشمنی کا جواب محبت سے دینا، ٹوٹتے بکھرتے رشتوں پر پھر سے غور کرنا وغیرہ۔ جیسے جذبات زندگی کو خوشگوار بنانے کے امکانات پیدا کر کے زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔

اِک آدمی ہوں محبت ہے آدمی سے مجھے
نہ بت شکن ہوں کوئی میں نہ بت پرست ہوں میں

درشن کنول

انسان کوئی ہو تو مرا درد جان لے
پتھر بنا کھڑا ہوں خداؤں کے شہر میں

اسلم حبیب

میں نے آدابِ خرد سیکھ لیے ہیں لوگو!
اب مرے پاؤں میں زنجیر نہ ڈالی جائے

مشتاق وارثی

لٹے ہیں راہ میں سو بار لیکن
سفر کا حوصلہ اب بھی وہی ہے

پورن سنگھ ہنر

ایک تنا آور پیڑ کو چھوٹے سے پودے نے کہا
ہوتے ہوتے ایک دِن میں ہو ہی جاؤں گا بڑا

ویدو ر ما راز

آندھی نے جنھیں جڑ سے اُکھاڑا تھا کئی بار
اُن پیڑوں پہ ہم برگ و ثمر دیکھ رہے ہیں

سلیم زبیری

مایوس ہو کے بیٹھنا عادت نہیں مری
اس تیرگی میں ڈھونڈنا ہے روشنی مجھے

محسن عثمانی

اِن کو روٹی نہیں وعدوں کے کھلونے دیدو
لوگ ان پڑھ ہیں بہل جائیں گے بہلانے سے

محسن عثمانی

کہانی سنتے ہیں نانی سے اب بھی بچے مگر
نہ اس میں گھوڑا ، نہ راجہ، نہ کوئی رانی ہے

ندیم پرمار

ہر ایک شخص زمانے کا اِک کہانی ہے
یہ بات عمر گنوا کر ندیم جانی ہے

ندیم پرمار

یہ چاہیے کہ کریں غور پھر سے رشتوں پر
علاج درد کا ترکِ تعلقات نہیں

ستنام سنگھ خمار

کبھی اپنا کبھی لوگوں کا غم ہوتا ہے پہلو میں
محبت کرنے والے دِل کہاں آرام کرتے ہیں

ستنام سنگھ خمار

سورج سے بھی آنکھ ملا کر بات کروں
مجھ کو وہ بے باک نظر دے یااللہ

خالد کفایت

اُجڑے ہوئے چمن میں پھر سے بہار دیکھیں
ہرسمت جل اٹھیں پھر غم خانے زندگی کے

محمد افضل

جکڑے ہوئے ہے پانو کو مٹی زمین میں
طوفاں سے ہم کنار ہیں شاخیں درخت کی

خمار

شاید بہار لوٹ کر آجائے پھر اِدھر
اے دوستو خلوص کی خوشبو لٹائیے

محمد افضل

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہوا کے زور پر تنکا تنکا بکھر جائے گا آشیاں بنانے کی خواہش، دِن میں ہزاروں میل دور نکل جانے پر بھی شام کو گھر پلٹ آنے کی اُمید، حالات سے راہِ نجات حاصل کرنے کے لیے ہر ایک بات پر ہنسنے کی کوشش، عقلِ انسان کی کتاب جہاں پر ختم ہوتی ہے اُس سے آگے سوچنے کے باب کا آغاز کرنا، ظالم کے ساتھ دو۔ دو ہاتھ کرنے کا حوصلہ، اور دنیا کی باتوں میں آ کر رشتوں کے پیڑوں کو کاٹ کر سایہ کرنے کی آرزو رکھنے والوں کو اِس کوششِ رائیگاں سے دور رہنے کی تلقین بھی پنجاب کی مابعد جدید غزل میں ملتی ہے۔

یہ مانا بکھر جائے گا تنکا تنکا
بنائیں تو پہلے کہیں آشیاں کو

دیپک قمؔر

پھر رہے ہیں وہ پہن کر شہرتوں کے ہار کو
سب کو پڑھواتے ہیں اپنے نام کے اخبار کو

دیپک قمؔر

دور کتنا بھی دِن کو جائے گا
شام ہوتے ہی گھر کو آئے گا

دیپک قمؔر

سوال کرتے ہیں صحرائے بے گنہ کب سے
ہر اِک ندی ہے رواں کیوں سمندروں کی طرف

پروین کمار اشکؔ

میں جس کی قربتوں میں جی لیا کرتا تھا وہ لڑکی
مری بے درد آنکھوں کو پرائی اچھی لگتی ہے

پروین کمار اشکؔ

آؤ ہر بات پہ ہنسیں طالبؔ
اور کوئی رہِ نجات نہیں

طالبؔ شملوی

ختم ہوتی ہے جہاں پہ عقلِ انساں کی کتاب
اُس سے اگلے باب کا آغاز کر جائیں گے ہم

مہیشؔ پٹیالوی

اُسی نے لوٹی تھی ابلا کی آبرو کل رات
سویرے بن کے جو مکھیا سبھا میں بیٹھا تھا

شبابؔ للت

آ گیا جب وہ آزمانے ہاتھ!
پھر مجھے بھی پڑے دکھانے ہاتھ!

پروین کمار اشکؔ

پاس آئے تو پرندے اُڑے شاخیں لچکیں
دور ہی سے نظر آئے تھے شجر پتھر کے

مسرورؔ لکھنوی

افسوس بہت ہے کہ یہ پورا نہیں اُترا
اُمید بہت رکھی تھی دنیا نے بشر سے

کرشنؔ پرویز

ہر گھڑی دُنیا کی باتوں میں نہ آیا کیجیے
کاٹ کر رشتوں کے پیڑوں کو نہ سایا کیجیے

عابدؔ سنامی

آ گیا جب کچھ سلیقہ ڈوب جانے کا ہمیں
اُس حسیں طوفان نے ہم سے کنارا کرلیا

سردارؔ پنچھی

چراغ کی خاصیت یہ ہے کہ اُسے بار بار جلایئے اور بار بار بجھایئے پھر بھی وہ تھکتا نہیں ہے۔ وہ سیاہ رات میں مہکتی ہوئی سحر سے کم نہیں ہے کہ جس کی روشنی نورِ وفا کی مانند ہے۔ وہیں چراغ کے برعکس سیاست روشنی دینے کے بجائے گھروں کے چراغ بجھا دیتی ہے۔ اندھیرا بانٹتی ہے، بدامنی پیدا کرتی ہے، قتل و خون کا بازار گرم کرتی ہے، مذہب اور مندر و مسجد کے نام پر تعصب پھیلاتی ہے لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون پی کر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ پنجاب کا شاعر جہاں سیاست کے مکروفریب کی بات کرتا ہے وہیں دوسری طرف تصوّف کے مسائل و موضوعات کو بھی اپنے غزلیہ اشعار میں پیش کیا ہے انسان کی معراج یہ ہے کہ اُسے ستاروں میں، بہاروں میں، نظاروں میں غرض ہر شے میں وہی ایک صورت دکھائی دیتی ہے جو اِس تمام کائنات کی خالق ہے اور جسے انسان پہچاننے سے قاصر ہے۔ اور جب انسان دُنیا کے ہر سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور دُنیا کی ہر آسائش سے لاتعلقی اختیار کر لیتا ہے تب کہیں جا کر زندگی کا دُشوار سفر آسان ہوتا ہے اور یہیں سے تصوّف کے سفر کا باقاعدہ آغاز ممکن ہوتا ہے۔

چراغ ہوں کبھی تھکتا نہیں ہوں جل جل کے
بجھانے والے تھکے خود بجھا بجھا کے مجھے

سردارؔ پنچھی

کھٹک رہی تھیں بہت بے حجابیاں سب کی
کسی کو کہتے بھی کیا بے لباس ہم بھی تھے

ڈاکٹر محمد رفیع

مری نظر میں ہیں روشن چراغِ نورِ وفا
سیاہ شب کی مہکتی ہوئی سحر ہوں میں

سکھدیو شرما رشکؔ

پھینکا تھا جس درخت کو کل ہم نے کاٹ کر
پتہ ہرا پھر اس میں نکلنے لگا ہے یار

رہبرؔ

لہو یہ پی چکی کتنا مگر پھر بھی نہیں بجھتی
سیاست نے دلوں میں آگ یہ کیسی لگائی ہے

راجیش آنند اسیرؔ

گھر کے تمام لوگ تو یکساں نہیں مہیشؔ
فطرت الگ الگ ہے لیاقت الگ الگ

مہیشؔ پٹیالوی

اب مجھ کو پُر پیچ سفر آسان ہوا
بستر باندھ کے بھیج دیا دریا کے ہاتھ

پریم کمار نظرؔ

ستاروں میں بہاروں میں نظاروں میں ہزاروں
وہی تو ایک صورت ہے جو پہچانی نہیں جاتی

تمنّا لدھیانوی

الٹ دی ہے نقاب اُن کی ہوا کے ایک جھونکے نے
اندھیرے سے اُجالے کا جنم بولیں تو کیا بولیں

سردار پنچھی

اس دنیا کے انسانوں کی شروع ہی سے یہ فطرت رہی ہے کہ جب بھی کوئی شخص نیا کام کرتا ہے یا نیا قدم اُٹھاتا ہے اور اپنے لیے زمانے سے الگ راہ بنانا چاہتا ہے یا پھر آسمانوں کی بلندیوں پر اُڑنا چاہتا ہے تو زمین کے لوگ اس کی حوصلہ شکنی کر کے اور اُس کے پَر کتر کے اُسے ناکارہ بنانے کی سازشیں کرنے لگتے ہیں۔ لیکن جن کے اِرادے پختہ اور حوصلوں میں جان ہوتی ہے وہ لوگوں کی پرواہ کِیے بغیر آسمان کو چھونے کی خاطر بے خوف و خطر پرواز کرتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ہواؤں میں اُڑنے کے لطف سے واقف ہوتے ہیں اور انھیں اونچا اُڑنے کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔ لیکن اُن کے اُڑنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ آسمانوں میں اُڑنے کے باوجود زمین سے اپنا تعلق ختم نہیں کرتے۔

آسمان میں اونچا اُڑنے کی خواہش، اندھیرے سے اُجالے کا ظہور ہوتے ہوئے دیکھنا، اُجالے کے لیے گھر جلانے کے بجائے سورج کو کھینچ لانا، اخلاص کی خاطر خود کو فنا کر دینا، زمانے کے بدلتے ہوئے چلن کے پیشِ نظر کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہ کرنا اور گھر کے تمام لوگوں کی الگ الگ قابلیت اور الگ الگ مزاج ہونے کی سچائی کو قبول کرنا، یہ وہ تمام رویّے ہیں جو پنجاب میں مابعد جدید غزل کی شناخت کے لیے کافی ہیں۔

ہوا میں اُڑنے والوں کو تو اُڑنا خوب آتا ہے
زمیں کے لوگ اپنی گفتگو کرتے ہی رہتے ہیں

ناشرؔ نقوی

میں آسمان سے اونچا اُڑا ہوں اے زاہدؔ
اور اِس طرح کہ زمیں سے کبھی جُدا بھی نہ تھا

زاہدؔ ابرول

جہاں کہیں بھی ہو سورج کو کھینچ لائیں گے
اُجالے کے لیے کیوں گھر جلا دیئے جائیں

اجیت سنگھ حسرتؔ

کسی سے اب گلا کرنا کہاں کی دانش ہے
بدل گیا ہے وہ پہلا چلن زمانے کا

اجیت سنگھ حسرتؔ

تری محفل کی ہر رونق، مری مرہونِ منّت ہے
میں آجاؤں تو مے خانہ، میں اُٹھ جاؤں تو ویرانہ

اخترؔ ہرے واسیہ

مجھ کو نفرت سے نہ دیکھو کہ کبھی منزل میں
اینٹ اک کام سرہانے کا بھی دے سکتی ہے

اخترؔ ہرے واسیہ

میں نام کا فانیؔ ہوں تمنائیں ہیں اتنی
مرنے کے لیے میں کبھی تیار نہیں ہوں

ہرجیت فانیؔ

اخلاص کی خاطر میں فنا خود کو کروں گا
بیکار میں جینے کا طلب گار نہیں ہوں

فانیؔ

خلوصِ دل سے جو ملتا ہے میزباں کی طرح
وہ ایک شخص ہے لگتا ہے کل جہاں کی طرح

فانیؔ

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	مابعد جدیدیت مضمرات و مُمکنات	وہاب اشرفی	۱۴۳
۲۔	ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات گوپی چند نارنگ بحوالہ جدیدیت مضمرات و ممکنات	وہاب اشرفی	۱۴۳
۳۔	مابعد جدیدیت مضمرات و مُمکنات	وہاب اشرفی	۱۴۶
۴۔	مابعد جدید غزل: اظہار کے چند پہلو ڈاکٹر خورشید احمد، بحوالہ معاصر اُردو غزل	پروفیسر قمر رئیس	۲۳۸_۳۹
۵۔	ادب کی آبرو	دیویندر اِسّر	۳۸
۶۔	ادب کی آبرو	دیویندر اِسّر	۴۳_۴۴
۷۔	جمنا تٹ ''جدید نظم نمبر'' اُردو نظم کا سفر: جدید شاعری سے مابعد جدیدیت تک	ڈاکٹر محمد ایوب	۷۱

باب پنجم

روایتی غزل کا مثبت رُجحان

کسی بھی چیز کے مثبت رُخ یا پہلو کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اُس کے منفی پہلو یا رویّے کو سامنے رکھا جائے۔ پنجاب کی روایتی غزل کے مثبت رجحان کا جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو غزل کے اُس مجموعی منفی رجحان کا مختصر سا جائزہ لیا جائے جس نے غزل کے نقادوں کے لیے اردو غزل کو ''فرسودہ'' اور ''نیم وحشی'' صنفِ سخن قرار دینے کا جواز عطا کیا۔ قدیم دور کی اُردو غزل بالخصوص میرؔ و سوداؔ کے عہد کی غزل میں منفی رجحان شدّت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس دور کی غزل کے موضوعات بھی روایتی اور محدود ہیں۔ ذاتی محرومیوں کے علاوہ میرؔ و سوداؔ کا دور تباہیوں، بربادیوں، خوں ریزیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں اور شکستوں کا پُر آشوب دور تھا۔ دِلّی کا بار بار اُجڑنا، مغل سلطنت کا زوال، انگریزوں کی بالادستی، اپنوں کی بیگانگی اور عشق کی ناکامیوں جیسے موضوعات اس دور کی غزل کی پہچان ہے۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں
تھا کل تلک دِماغ جنھیں تخت و تاج کا

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

اس دور کی غزل میں جو یاسیت، قنوطیت اور لاتعلقی پائی جاتی ہے اس کے بارے میں عبدالاحد خاں خلیل رقمطراز ہیں:

''ان لوگوں نے داخلیت اور واقعیت پر زور تو دیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی کی نمایندگی میں ایک ''مخصوص طبقہ'' کی ترجمانی کو کافی سمجھا اور

''نچلے طبقہ'' سے کچھ زیادہ واسطہ نہیں رکھا اس کمی کو اگر کسی حد تک پورا کیا تو وہ نظیر اکبر آبادی کی غزل گوئی اور شاعری ہے''۔[1]

روایتی غزل کا غالب ترین رجحان شدید داخلیت، قنوطیت اور لاتعلقی ہے۔ زندگی سے فرار، ناامیدی، یاس و حرماں، وحشت، یاسیت، اُداسی، لاتعلقی، بے سمتی، اضطراب و انتشار، خوداذیتی، رنج والم کے علاوہ غزل کے بنیادی اور اصل موضوعات حسن و عشق، حدیثِ دلبراں اور غمِ جاناں بھی روایتی غزل میں کثرت سے موجود ہیں۔ عشق کی تہمتیں، رسوائیاں، بے وفائیاں اور ہجر و وصال کی تمام کیفیات کائناتِ غزل میں موجود ہیں۔

روایتی غزل میں شراب و مے خانہ، ساقی کی بے التفاتی، شیخ و برہمن کی پند و نصیحت، محبوب کی ناز و ادائیں، گُل و بلبل سے ہم کلامی، صیّاد کی بے رحمی، قفس کی گھٹن، محبوب کا ہرجائی پن، رقیبوں کی سازشیں، صحراؤں سے رغبت اور خلوت میں اُبھرنے والے تصوّرات و خیالات ایسے موضوعات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

میرؔ

اذیت ، مصیبت ، ملامت ، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

دردؔ

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سوداؔ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ذوقؔ

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ذوقؔ

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

میرؔ

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

دردؔ

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبی کرے فرامش زنار بھول جاوے

آبروؔ

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

غالبؔ

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالبؔ

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولیؔ

حسن و عشق کے علاوہ اس دور کی روایتی غزل میں تصوّف اور دنیا کی بے ثباتی

جیسے موضوعات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ کم ہمتی قناعت پسندی اور بے عملی کا رویہ بھی روایتی غزل کا حصہ ہے اس دور کی غزل میں، بلند ہمتی اور حرکت وعمل کا فلسفہ برائے نام ہے۔

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

غالب

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

سودا

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

درد

قدیم دور کی غزل کے بارے میں وزیر آغا نے صحیح لکھا ہے کہ:

''بحیثیتِ مجموعی اس سارے دور کی رُوح ایک ڈری سہمی ہوئی عاقبت کوشی میں مبتلا، زخمی اور پٹی ہوئی روح تھی۔ چنانچہ اس دور کی غزل نے اس روحِ عصر کی ترجمانی میں کبھی تو فریاد کی صورت اختیار کی اور کبھی صوفیانہ مسلک کے تحت زندگی کے مظاہر کو خندہ استہزا میں اُڑانے کی کوشش میں مصروف نظر آنے لگی''۲؎

روایتی غزل میں حسن وعشق کا جو رجحان ملتا ہے اس کے بارے میں یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی نام ہے علائق کا۔ جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا اور جہاں جذبہ ہوگا وہاں کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہوگا۔ جس طرح فطرت کے مظاہر اور اُن کی قوتیں علائق کی

زنجیر میں بندھی ہوتی ہیں اسی طرح زندگی بھی تعلقات کی سنہری ڈوریوں میں
جکڑی ہوئی ہے۔ یہ تعلق فطری بھی ہے اور معاشرتی بھی''۳

ہجر و وصال بھی روایتی غزل کا محبوب موضوع رہا ہے۔ محبوب کے وصل کی لذتوں اور ہجر کی کیفیات کا بھرپور اظہار بھی روایتی غزل میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہجر و وصال سے متعلق سینکڑوں کیفیات ہیں جن کی طرف نیاز فتحپوری نے اشارہ کیا ہے۔

''ہجر کے بیان میں دل کی بیتابی، تمناؤں کا ہجوم، غم والم کی فراوانی، بے چارگی و بے بسی، جنون و دیوانگی، حیرانی و مجبوری، بیماری، نزع و موت سبھی کچھ شامل ہے۔ اسی طرح وصل میں کامرانی و سرمتی نشاط و از خود رفتگی، شکرِ وصل و شکوہِ ہجراں، عدو کی برائی، اپنی تعریف اور پھر فراق کے اندیشہ سے آئندہ کے لیے پیش بندیاں وغیرہ سینکڑوں باتیں شامل ہیں''۴

محبوب کے حسن و جمال اور اُس کے اعضاء کی تعریف کو اُردو غزل میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور غزل کا بنیادی موضوع بھی محبوب کا سراپا اور اس کی تعریف ہی ہے فارسی کے غزل گو شاعر حافظؔ نے تو محبوب کے گال کے تل کے بدلے سمرقند اور بخارا شہر دینے تک کی بات کہہ دی تھی۔ جب محبوب حد درجہ حسین و جمیل ہو تو پھر اپنی جان کی پرواہ کون کرتا ہے لیکن عبدالسلام ندوی نے محبوب کے جسمانی اعضاء کی تعریف کرنے والے شعراء کو اچھے غزل گو شعراء کے زمرے ہی سے خارج کر دیا ہے۔

''معشوق کے جسمانی اوصاف کی تعریف غزل کی حقیقت سے خارج ہے، اس لیے جو شعراء اس قسم کے مضامین سے غزل میں کام لیتے ہیں، وہ بہترین غزل گو شاعر نہیں تسلیم کیے جا سکتے''۵

روایتی غزل پر تنقید کرتے ہوئے حالیؔ نے اردو غزل کی اصلاح کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا اور جو مشورے دیے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

''ہماری رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع

الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع واقسام اور تمام جسمانی
اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں''[6]

آگے چل کر حالی لکھتے ہیں کہ:

''مذکورہ بالا مضامین (عشق ومحبت، خمریات اور زہاد پر طنز) کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اُٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت، یا شکر یا شکایت، یا صبر یا رضا، یا قناعت یا توکل، یا رغبت یا نفرت یا رحم یا انصاف یا غصہ یا تعجب یا اُمید یا نا اُمیدی یا شوق یا انتظار یا حبِ وطن یا قومی ہمدردی یا رجوع الی اللہ یا حمایتِ دین ومذہب یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا اور کوئی جذبہ، جذباتِ انسانی میں سے، اس کو بھی غزل میں بیان کرسکتے ہیں''[7]

روایتی غزل کو محض اِس بنا پر کہ اِس کا محور حسن وعشق ہے اور وارداتِ قلبی کو اِس میں خاص عمل دخل ہے، موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ روایتی غزل میں یاسیت اور نا اُمیدی کا پہلو ایک زمانے میں غالب ضرور رہا ہے لیکن زندگی کے مسائل ومُشکلات سے نبرد آزمائی کا مثبت رویہ بھی روایتی غزل میں موجود ہے۔ اگر روایتی غزل کے مثبت رویّے کی بات کی جائے تو میر وسودا کے دور کی شاعری میں ذاتی درد وغم کے ساتھ ساتھ سماجی شعور، سیاسی بیداری اور اقتصادی مسائل وموضوعات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے کے ابواب میں بھی ذکر کرچکے ہیں کہ ادب خلاء میں تخلیق نہیں ہوتا، ادب اپنے عہد اور سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج بدلتا ہے تو ادب بھی بدلتا ہے۔ شاعر وادیب وہی لکھتا ہے جو کچھ کہ وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور سماج میں رہتے ہوئے جن حالات وواقعات سے وہ دوچار ہوتا ہے اُن تمام واقعات واحساسات اور مشاہدات وتجربات کو اپنے فن میں پیش کرنے کے لیے خود کو مجبور پاتا ہے۔

اس طرح قدیم شعراء نے جہاں اپنی شاعری میں ذاتی غم کو پیش کیا ہے وہیں

اپنے عہد اور سماج کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ جس کی بہترین مثال اُردو کے شہرِ آشوب ہیں۔ شاعری میں موضوعاتی جدّت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جو چیز شاعری کو صحیح معنوں میں شاعری بناتی ہے وہ اُس کے محض موضوعات نہیں بلکہ اُس کا فن ہے۔ اِسی اصول کے پیشِ نظر ہمارے قدیم شعراء نے فن کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ شعر کہنے کا سلیقہ ہی فنِ شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ غزل کے قدیم شعراء نے نہ صرف یہ کہ فنّی پابندیوں کو ملحوظ رکھا بلکہ غزل کی ہیئت میں بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ قدیم شعراء کے ہاں زبان و بیان کا سلجھا ہوا شعور عصری حسّیت اور جمالیاتی شعور کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور بھی ملتا ہے۔

روایتی غزل کی ایک امتیازی شان اُس کا تغزّل ہے۔ غزل کے لیے تغزّل اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسم کے لیے روح اور پھول کے لیے خوشبو۔ تغزّل کے بغیر غزل شاعری تو ہو سکتی ہے لیکن غزل قطعی نہیں۔ خالص غزل وہی ہے جس میں تغزّل کی چاشنی موجود ہو۔

بقول پروفیسر عنوان چشتی:

> ''تغزّل بظاہر ایک قدیم پیش پا اُفتادہ اور روایتی اصطلاح ہے لیکن بنیادی طور پر یہ شاعری کا ایک اہم رجحان اور مزاج ہے۔ جس کے بغیر شاعری کا تصور نہیں کیا جا سکتا'' [۸]

روایتی غزل محض حسن و عشق کے موضوعات سے عبارت نہیں ہے۔ اس میں زندگی کے دیگر موضوعات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ حسن و عشق ہی اس کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

> ''مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل میں عاشق و معشوق کے علاوہ خالق و مخلوق، حاکم و محکوم، خادم و مخدوم، ظالم و مظلوم، مختار و مجبور وغیرہ کے باہمی تعلقات بھی دکھائے گئے ہیں'' [۹]

پنجاب کے غزل گوشعراء نے روایتی غزل کے جس مثبت رجحان کو اپنایا اور آگے بڑھایا اُس کی ابتدا غالبؔ اور حالیؔ کی جدید شاعری سے ہوتی ہے۔ غالبؔ اور حالیؔ نے نہ صرف یہ کہ روایت سے گریز کیا بلکہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے لیے بھی راہیں ہموار کیں۔ غالبؔ کے ہاں اگر سادگی، جدّت اور پہلوداری پائی جاتی ہے تو وہیں حالیؔ کے ہاں قومی و ملّی مسائل کے ساتھ ساتھ حُبّ الوطنی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ حالیؔ اور معاصرینِ حالیؔ نے روایتی استعارات کو نئے معنی و مفاہیم عطا کیے اور ایرانی تشبیہات و استعارات کی جگہ ہندوستانی لفظیات وتشبیہات و استعارات اور تراکیب استعمال کیں۔ حالیؔ نے ''مقدمہءشعروشاعری'' میں فن کے جن اصولوں اور موضوعات پر بحث کی ہے اُن کو پنجاب کے غزل گوشعراء نے بھی اپنایا ہے اور شاعری میں نئی نئی گنجائشیں اور امکانات پیدا کیے ہیں۔

آزادی کے بعد پنجاب کے شعرا نے غزل کی جس روایت کو آگے بڑھایا اس میں منفی رویّے پر مثبت رویّہ غالب ہے اور یاس وحرماں نصیبی کا ماتم کرنے کی جگہ ہمت وحوصلہ، اُمید، کائنات سے تعلق، انسان دوستی، داخلیت کی جگہ خارجیت، رجائیت، اپنائیت، آشنائی، توانائی، جواں مردی، عزم و حوصلہ، حرکت وعمل، غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں، راست گامی، سرخ روی وسرشاری، وارداتِ قلبی، حسن وعشق کے موضوعات اور ہجر ووصال کے موسم یہاں بھی موجود ہیں مگر اپنے مثبت رنگ میں بد دِلی اور بد دماغی کا پنجاب کی شاعری میں شائبہ تک نہیں ہے پنجاب کی شاعری میں رونے رُلانے کی جگہ ہنسنے ہنسانے اور زندگی جینے کا حوصلہ عطا کرنے کا جذبہ موجذن ہے۔ زندگی میں دشواریاں ضرور ہیں مگر کم ہمتی نہیں ہے۔ مشکلوں کو حل کرنے کا حوصلہ' آگے بڑھنے کا جذبہ، پُر خار وادیوں کو گلزار بنانے کا ہنر پنجاب کے شعراء کو خوب آتا ہے وہ کسی ایک منزل پر تھک کر نہیں بیٹھتے نہ ہی انھیں کڑی دھوپ میں کسی سایہ دیوار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر پنجاب کی اُردو غزل میں کہیں کہیں جذوی طور پر یاسیت اور نا اُمیدی کی فضا پائی بھی جاتی ہے تو وہ میرؔ وسوداؔ کے دور کی طرح دائمی نہیں وقتی ہے جس سے شاعر جلد ہی اُبھر آتا ہے اور اُبھرنے کے بعد

اپنے اندر تازگی اور نیا جوش محسوس کرتا ہے۔ تازگی اور حرارت حاصل کرنے کے بعد خوب سے خوب تر کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ سیلابِ حادثات کا منہ موڑنا، عزم وعمل کے ساتھ زندگی کے راستوں کو ہموار کرنا، خدمتِ خلق کے ذریعے خدا کو تلاش کرنا، محبوب کی بے وفائی سے بھی پیار کرنا غمِ دوراں سے آنکھ ملا کر بات کرنا، قفس میں پہنچ کر امتیازِ بہار و خزاں سے بالاتر ہو جانا پرائی آگ میں جلنا اور اپنے ماحول کی آگ کو اکیلے بجھانا، دُعا پر اعتبار نہ کر کے ہمت وعمل سے کام لینا، غمِ دوراں کو غمِ جاناں میں شامل کرنا۔

خدا سے محبت کرنے سے پہلے اُس کے بندوں سے محبت کرنا، تقدیر کے ہاتھوں ہر طرح سے برباد ہونے کے باوجود بھی آباد ہو کر دِکھانے کا عزم۔ زندگی کو موت کے سانچے میں ڈھال کر موت کو نیچا دِکھانے کا اِرادہ، یاس کے پردے سے اُمید کا سورج نکالنا، کانٹوں میں رہ کر پھول کھِلانا، قفس کے غم اور آشیانے کی راحت کو پرواز کا دُشمن سمجھنا، سُرخ گلابوں کی طرح کھِل کر اپنی زندگی گذارنا اور غموں کی دھوپ میں بھی مسکرانے کی ادا رکھنا پنجاب کی نئی غزل کی شناخت ہے۔

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گذرے جدھر سے ہم

ساحر لدھیانوی

سیرِ گلزار سے بددل نہ ہو، ناداں اتنا
چند پھولوں میں سہی، بوئے وفا ہے تو سہی

رام رتن مضطر

سیلابِ حادثات کا مُنہ موڑ دیں گے ہم
سر سے گذر چلا ہے جو پانی تو کیا ہوا

رام رتن مضطر

ہر چند زندگی میں نشیب و فراز تھے
عزم و عمل سے راستہ ہموار ہوگیا

رام رتن مضطر

خدمتِ خلق سے ملے گا خدا
بندگی سے خدا نہیں ملتا

رام رتن مضطر

ہمیں ہیں جو تمہاری بے وفائی پر بھی مرتے ہیں
وگرنہ زہر آنکھوں دیکھ کر کھایا نہیں جاتا

رام رتن مضطر

ٹھہر بھی اے غمِ دوراں یہ کیا قیامت ہے
بہت سے اور بھی ہیں کام آدمی کے لیے

ساحر سیالکوٹی

ساحر بلند و پست سے ہے شان رہ روی
دل منفعل ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ساحر سیالکوٹی

ساحر قفس میں ہم کو یہ عظمت ہوئی نصیب
بالا ہیں امتیازِ بہار و خزاں سے ہم

ساحر سیالکوٹی

گو مجھ میں جور سہنے کی تاب و تواں نہیں
پھر بھی مجھے شکایتِ جورِ بتاں نہیں

ساحر سیالکوٹی

پرائی آگ میں جلنا بہت دشوار ہے ساحرؔ
یہ کام انساں کو لازم تھا، مگر کرتا ہے پروانہ

ساحرؔ سیالکوٹی

بڑھ کے اس آگ کو آزادؔ اکیلا ہی بجھا
کیا ہوا گر تیرا ماحول ترے ساتھ نہیں

جگن ناتھ آزادؔ

اے شاعرِ امروز، کر انساں سے تخاطب
افلاک پہ اب فاش نہ کر رازِ نہانی

جگن ناتھ آزادؔ

او ننگِ اعتبار دعا پر نہ رکھ مدار!
او بے وقوف ہمتِ مردانہ چاہیئے

حفیظؔ جالندھری

کشتی خدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں

حفیظؔ جالندھری

اب تو حالات یہ کرتے ہیں تقاضا شائقؔ
غمِ دوراں کو شریکِ غمِ جاناں کرلوں

اودے سنگھ شائقؔ

ہر ایک حال میں وہ کیوں نہ خوش رہے شائقؔ
جو امتیازِ خزاں و بہار سے گذرے

ودے سنگھ شائقؔ

خدا سے کیا محبت کر سکے گا
جسے نفرت ہے اُس کے آدمی سے

نریش کمار شاد

ایک دِن آباد ہوکر میں دکھا دوں گا تجھے
جس قدر برباد کر سکتی ہے اے تقدیر کر

رتن پنڈوروی

زندگی کو موت کے سانچے میں ڈھالوں اے رتن
اور ظالم موت کو نیچا دکھا کر دیکھ لوں

رتن پنڈوروی

رونے سے کیا ملے گا کہ سیلابِ گریہ سے
تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہ جائے گا

محروم

یاس سے اُمید ہو جاتی ہے اکثر رونما
رات کے پردے میں ہو جاتا ہے سامانِ سحر

محروم

کانٹوں میں رہ کے پھول یہ تو نے کھلائے ہیں
محروم خوش ہیں تیری گل افشانیوں سے ہم

محروم

بے سود ارادہ مقتل کا' بے کار دُعا مرجانے کی
موت اپنے وقت پر آئے گی بے وقت نہیں وہ آنے کی

جوش ملسیانی

اب کی بیشی کا رونا کِس لیے؟
جو مقدر میں لکھا تھا مِل گیا

نسیم نور محلی

جہاں کی شکل بدل ڈالتے ہیں سرتاسر
کچھ ایسے لوگ بھی جہاں میں پیداہوتے ہیں

پورن سنگھ ہنر

عشق میں کب یہ ضروری ہے کہ رویا جائے
یہ نہیں داغِ ندامت جِسے دھویا جائے

گوپال متل

خدا گواہ کہ دونوں ہیں دشمنِ پرواز
غمِ قفس ہوکہ راحت ہو آشیانے کی

گوپال متل

کل تو ہونا ہے ہمیں زردیٔ موسم کا شکار
آج تو کِھل کے رہیں سُرخ گلابوں کی طرح

نوبہار صابر

ہم نے گو لاکھ غم اُٹھائے ہیں
پھر بھی ہر وقت مُسکرائے ہیں

وفا پٹیالوی

خود شکستہ پا ہوں چوراہے پہ لیکن بیٹھ کر
راہگیروں کو سفر کا حوصلہ دیتا ہوں میں

گوردیال سنگھ بھاٹیہ عارف

مُسکراؤ گے تو بخشو گے خوشی ماحول کو
زندگی تو رو کے بھی ورنہ بسر ہوجائے گی

گوردیال سنگھ بھاٹیہ عارف

برس جائے تو چھٹ جائے گی کتنی بھی گھنی ہوگی
گھٹا آفات کی کیسی ہولیکن عارضی ہوگی

گوردیال سنگھ بھاٹیہ عارف

آزاد شکایت کیا بے مہریء عالم کی
کچھ گرد بھی اُڑتی ہے جب قافلہ چلتا ہے

آزاد گورداس پوری

آدمی وہ ہے کہ اوروں کو سنبھالا جس نے
خود کو جذبات کی رو میں کبھی بہنے نہ دیا

سکھ دیو شرما رشک

بے حرمتیء حضرتِ آدم کو دیکھ کر
اپنے تو دل میں حسرتِ جنّت نہیں رہی

صابر ابوہری

زندگی عیش و طرب میں خوش کبھی رہتی نہیں
یہ کلی کھِلتی نہیں جب تک الم سہتی نہیں

صابر ابوہری

ہنستے ہنستے جو بشر کانٹوں پہ چل سکتا نہیں
وہ زمانے کی ہوا کا رُخ بدل سکتا نہیں

صابر ابوہری

منزلیں بلاتی ہیں خود انہیں اشاروں سے
ہنس کے جو گذرتے ہیں غم کے خارزاروں سے

شبابؔ للت

قوتِ ارادی سے مانگ ہر مراد اپنی
مانگتا ہے کیا ناداں بخت کے ستاروں سے

شبابؔ للت

ایک گہری خامشی ہے شورِ طوفاں کا جواب
اے دلِ ناکام! عالی ظرفیٔ ساحل کو دیکھ

شبابؔ للت

ملتا ہے مدّتوں کے عمل سے کوئی مقام
لعل و گہر ازل سے تو لعل و گہر نہ تھے

شبابؔ للت

کب وہ رُکتے ہیں کسی منزل پر
جن کو چلنے میں مزا آتا ہے

جگرؔ جالندھری

غمِ ہستی سے جو ڈر جاتے ہیں
مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں

جگرؔ جالندھری

روٹھ جاتے ہیں کنارے جن سے
ڈوب کر پار اُتر جاتے ہیں

جگرؔ جالندھری

ہم میں ایک یہی خوبی ہے بس اتنی فنکاری ہے
بات کریں جب اپنے فن کی سب کے من کی بات کریں

تاثیر

نثار جان ہو اوروں کی بہتری کے لیے
یہ کارِ خاص ہے دنیا میں آدمی کے لیے

تاثیر

درد اب تک جو ملے پھیکے تھے
حادثہ وہ دے جو پاگل کر دے

پروین کمار اشک

کسی کے بھی جو کام آتا نہیں
وہ انسان دنیا میں آیا تو کیا

مترنکودری

مشکلوں میں اور بڑھ جاتا ہے میرا حوصلہ
مُسکرا دیتا ہوں ہر تازہ بلا کو دیکھ کر

مترنکودری

کامل ہو اگر شوق تو ہر کام ہے آسان
ہمت کو کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا

مترنکودری

آزادی کے بعد پنجاب میں روایتی غزل کا یہی وہ مثبت رجحان ہے جو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ خاموش دھارے کی طرح چلتا رہا۔ جس نے نامساعد حالات اور وقت کے اندھے اور گہرے سمندر میں خود کو ضم نہیں کیا۔ بلکہ اپنے لیے اسی سمندر میں راستہ پیدا کرتے ہوئے خراماں روی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ خارزاروں سے ہنس کر

گذرنے والوں کو منزلوں کا خود بُلانا، بخت کے ستاروں پر بھروسہ نہ کر کے قوتِ ارادی سے اپنی مرادوں کو پورا کرنا، شورِ طوفاں کا جواب گہری خامشی سے دینا، چلتے رہنے کا مزہ پا لینے کے بعد کسی بھی منزل کو آخری منزل نہ بنانا، کناروں کے روٹھ جانے کے بعد ڈوب کے پار اُترنا، خود شکستہ پا ہو کر بھی راہ گیروں کو سفر کا حوصلہ دینا، مسکرا کر ماحول کو خوشی بخشنا، خود کو جذبات کی رو میں بہنے سے بچاتے ہوئے اوروں کو سنبھالنا اور دُنیا میں آنے کے بعد دوسروں کے کام آنے کا انسانی جذبہ پنجاب کی نئی غزل میں بدرجہ اتّم موجود ہے۔

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	اردو غزل کے پچاس سال	عبدالاحد خاں خلیل	۶۹
۲۔	اُردو غزل: وزیر آغا جدیدیت تجزیہ و تفہیم	ڈاکٹر مظفر حنفی	۳۹۹
۳۔	اردو غزل	یوسف حسین خاں	۶۹۔۶۸
۴۔	انتقادیات	نیاز فتح پوری	۱۶۴۔۱۶۳
۵۔	شعر الہند (حصہ دوم)	عبدالسلام ندوی	۹۹۔۲۹۸
۶۔	مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی	۱۲۴
۷۔	مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی	۱۳۱
۸۔	آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل	پروفیسر عنوان چشتی	۱۸
۹۔	ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	۱۱۹

باب ششم

نئی اُردو غزل عصری تناظر میں

ہر عہد کا ادب اپنے معاصر عہد میں نیا ہوتا ہے۔ جو کل نیا تھا وہ آج پُرانا ہے اور جو آج نیا ہے وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ پُرانا ہو جائے گا لیکن اُردو ادب میں نئی غزل یا جدید غزل کا اطلاق ایک مخصوص عہد اور مخصوص رنگ کی غزل پر ہوتا ہے ہر چند کہ نئی غزل کی شروعات حالیؔ کے عہد میں ہو چکی تھی۔ حالیؔ کے عہد کی اردو غزل موضوعات کے اعتبار سے نئی ضرور تھی لیکن لفظیات اور استعارات کے لحاظ سے اس میں زیادہ تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئی تھیں سنہ ۱۹۶۰ء کے دہاکہ میں سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں انہوں نے ملکی اور عالمی منظر نامے کو پوری طرح بدل ڈالا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور معاشی معیار نے انسان سے اُس کی زندگی کا اعتبار ہی چھین لیا۔ انسان کو اپنا وجود بے معنی نظر آنے لگا۔ مذہبی دعوے کھوکھلے محسوس ہونے لگے دماغ منطق کی سوُلیوں پر لٹکنے لگے۔ اخلاقی اقدار قصہء پارینہ ہو گئیں۔ دغابازی، فریب، مکّاری، مذہبی منافرت اور دوغلہ پن انسان کی سرِشت میں شامل ہو گیا۔ اس لیے ۱۹۶۰ء کے آس پاس جو غزل لکھی گئی وہ نہ صرف یہ کہ لفظیات وعلامات اور موضوعات کے لحاظ سے بالکل نئی تھی بلکہ مذہب سے بھی بیزار تھی۔ حالیؔ کا اصلاحی رنگ اور اقبالؔ کا قومی اور پیامی رنگ بھی اس عہد کی غزل میں نہیں تھا۔ نئی غزل کی اِنھیں خصوصیات کا ذِکر کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

> ''نئی غزل کسی لازمے کا جبر قبول نہیں کرتی۔ وہ قطرے میں دجلہ کی تلاش کرتی ہے اور دریا میں فنا ہو کر عشرت کے حصول پر آمادہ نہیں۔ وہ عظمت کے بجائے حقیقت کا استعارہ بننا چاہتی ہے اور اپنے ذاتی تناظر کو کسی بھی تہذیبی، مذہبی، نظریاتی، فکری اور اخلاقی تناظر پر قربان کرنے سے دامن بچاتی ہے۔ نئی

غزل کے اچھے نمونے (اور بُرے نمونے ہر عہد کی اور کسی بھی فکری یا فنی مسلک کی پابندی شاعری میں عام ہیں) کلاسیکی غزل کی طرح نہ تو مروجہ اور مقبول تجربوں اور کوائف کے احاطے پر اکتفا کرتے ہیں نہ ترقی پسند غزل کی طرح کسی بیرونی اور وسیع تر تہذیبی مقصد کے تابع ہیں، بلکہ مانوس، حقیقی اور بیک وقت بیدار اور خوابیدہ زندگی کے کارزار میں احساس کی سطح پر اپنے ذاتی اشتراک اور اُس کے نتائج کی روداد سنانے کے بجائے اُن نتائج کا تاثر پیش کرتے ہیں۔ چوں کہ حقیقتوں کو دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کا زاویہ بدلا ہے اس لیے اظہار کی راہیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ نئی غزل میں الفاظ جامد حقیقتوں کے مظہر نہیں بنتے بلکہ جذبے کی حدت سے اُن حقایق کو سیال کر کے احساس کے سانچے میں ڈھالتے ہیں جن کے ذریعے ہنگامی اور لمحاتی تجربے بھی وقت اور مقام کے وسیع تر کینوس پر پھیل جاتے ہیں۔ نئی غزل فکر اور فن کو زیادہ آزادی عطا کرتی ہے۔'' [1]

نئی غزل، روایتی غزل اور ترقی پسند غزل سے موضوعاتی، فکری، علامتی اور لفظیاتی اعتبار سے مختلف ہے۔ روایتی غزل میں جذبۂ عشق کو مرکزیت حاصل تھی اور اس کا دائرہ کوچہ ٔ محبوب تک ہی محدود تھا۔ جلوۂ جاناں اور محبوب کی ناز و ادا ہی غزل کی کُل کائنات ہوا کرتی تھی۔ مے خانہ، محفلِ جاناں، چلمن، کوچہ، رقیب، صحرا و چمن، شمع و پروانہ، واعظ و ناصح، قاصد و نامہ بر، زاہد و پارسا، جام و صراحی، شراب و شباب، بہار و خزاں اور محبوب کے زلف و لب و رخسار یا الفاظ دیگر محبوب کا سراپا وغیرہ روایتی غزل کے محبوب موضوعات تھے۔ ترقی پسند شاعروں نے روایتی غزل کو فرسودہ اور بیمار شاعری قرار دیا۔ انہوں نے داخلی اور روایتی موضوعات کی جگہ خارجی اور عوامی مسائل و موضوعات کی اہمیت پر زور دیا۔ جہاں انہوں نے قاتل، مقتل، زنداں، سلاسل، تیغ، خنجر، پرچم، سلیب، دار و رسن، کھیت کھلیان، زردار، مزدور، دہقان، مفلس، بھوک، افلاس، جنگ، گرد، لہو، بھکاری اور تیشہ ایسے الفاظ

اُردو غزل میں کثرت سے استعمال کیے ہیں وہیں صیاد، قفس، شہید، قاتل، عاشق، ناصح، محتسب، حبیب، رقیب، گل، چمن، ہجر، وصال، آشیانہ، شفق، شب، صُبح، آندھی، پرندہ ایسے الفاظ کو طے شدہ معنی اور محدود دائرہ سے نکال کر نئے معنی و مفہوم عطا کیے۔ ترقی پسند اُردو غزل کو حسن و عشق کی خواب گاہوں سے نکال کر مقتل گاہوں میں لے آئے اور اِسے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آشنا کیا اور اِس کے نازک لبوں کو شرابِ ہوش رُبا کے بجائے مئے تلخیء حالات کا ذائقہ عطا کیا۔ ترقی پسندوں نے زیادہ تر وقتی اور ہنگامی موضوعات ہی کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ ترقی پسند غزل کا سفر داخلیت سے خارجیت کی طرف رہا جبکہ نئی غزل ترقی پسند غزل کے برعکس خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر کرتی ہے۔ نئی غزل کے اندر بے چارگی، شکستِ ذات مایوسی اور ناامیدی کی جو داخلی فضا ملتی ہے اسی سبب سے ترقی پسندوں نے اِسے بیمار ذہن اور نفسیاتی مرض سے تعبیر کیا۔ لیکن نئی غزل کے بارے میں ڈاکٹر شمیم حنفی کا نظریہ مختلف ہے وہ نئی غزل کی تشکیک اور نامرادی کے احساس کو ایک نئے ایمان کی جستجو کا اشاریہ مانتے ہیں۔ اگر نئی غزل کی زبان کی بات کی جائے تو نئی غزل کی زبان روزمرہ کی زبان نہ ہو کر علامتی اور تخلیقی زبان ہے۔ جس کی اپنی ایک مخصوص فضا ہے۔ نئی غزل جن مخصوص حالات اور ماحول کی پروردہ ہے اس کو اُسی مخصوص ماحول اور حالات کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ نئی غزل میں زبان کا جو تخلیقی اور علامتی استعمال ہوا ہے اُس کے متعلق ڈاکٹر شمیم حنفی رقمطراز ہیں کہ:

> ''نئی غزل چونکہ زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیتی ہے اس لیے مختلف شعراء کے یہاں ایک ہی لفظ الگ الگ معنوی اور حسی فضا خلق کرتا ہے۔ سامنے کی مانوس اور جانی پہچانی اشیاء کو علامت بنانے کی کوشش اور غیر مرئی کیفیتوں کی تجسیم نے نئی غزل کو ماضی کے لفظی اور معنوی تلازمات سے الگ کر کے ایک ایسی زبان سے متعارف کرایا جو اُردو لُغت کا حصّہ ہونے کے باوجود غزل کی

لفظیات میں اضافے کا حکم رکھتی ہے۔ نئی غزل کی زبان نہ تو روزمرہ کی زندگی کی زبان ہے اور نہ شاعری کی آراستہ اور مرصّع زبان کے قدیم تصوّر سے کوئی علاقہ رکھتی ہے۔ پھر بھی غزل کی مخصوص ہئیت کا جبر ایک حد تک نئی غزل کی زبان کے ارد گرد بھی حدیں قائم کرتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی سے لے کر اکتساب و استفادے کی منزل سے گذرنے والے چند بالکل نئے شعراء تک کے یہاں شائستہ لہجے، صاف اور سادہ الفاظ اور تربیت یافتہ آہنگ کی حدود میں بھی وسعتِ احساس کے اظہار کی قابلِ قدر تصویریں نظر آتی ہیں۔ غزل کے فارم کی پابندیاں، اُن کی مجبوری نہیں بنتیں، مجموعی طور پر نئی غزل کی زبان استعارے کی زبان ہے اور اس کے لہجے میں گرچہ بیک وقت سوؔدا، آتشؔ اور یگاؔنہ کے مردانہ پن، میرؔ کے نرم رو اور اُداسی کی آنچ میں تپے ہوئے پرسوز آہنگ اور غالبؔ کے منطقی اسلوب کی پرچھائیاں ملتی ہیں لیکن بالعموم نئے غزل گو کا لہجہ عاقلانہ، واعظانہ اور خطیبانہ نہیں بلکہ خود کلامی کا ہے'' [۲]

زندگی اے زندگی آ دو گھڑی باتیں کریں
تجھ سے میرا عمر بھر کا تو کوئی جھگڑا نہ تھا

آزؔاد گلاٹی

جھجک رہا تھا وہ کہنے سے کوئی بات ایسی
میں چُپ کھڑا تھا کہ سب کچھ مری نظر میں تھا

باؔنی

بلندیوں پہ تھا محوِ سفر ہوا کی طرح
لباسِ خاک جو پہنا تو خاکسار ہوا

کمار پاشی

کوئی منظر ہے نہ عکس ، اب کوئی خاکہ ہے نہ خواب
سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے

بانیؔ

وہ دیودار کی ٹہنی پہ رُک گیا سا چاند
ہوا چلے تو ابھی کروٹیں بدلنے لگے

بمل کرشن اشک

ادارہ ماھنامہ ''تحریک'' دھلی کے ذریعے پوچھے گئے ایک سوال: جدید ادب، قدیم ادب سے انحراف ہے یا اُس کی بنیادی اقدار کی پامالی؟ کے جواب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں کہ:

''جدید ادب کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ ادب کی ادبی اقدار کی بحالی کے لئے کوشاں ہے۔ حالیؔ کے زمانے میں سرسیّد تحریک کے اثر سے جو انحراف اصلاح پسندی کی صورت میں رونما ہوا تھا، اس میں پھر بھی ادبی اقدار کی اہمیت تھی۔ وطنی اور سماجی تحریکوں کے عروج کے زمانے میں ادب کے اصلاحی، سماجی اور تعمیری پہلوؤں پر زور دیا جانا ناگزیر ہے۔ لیکن اس صدی کی چوتھی دہائی میں ایک گروہ نے مقصدیت اور افادیت کی احترامی اصطلاحات کے پسِ پردہ ادب کو سیاسی تبلیغ کا آلۂ کار بنانے کی جو کوشش کی، جدید اردو ادب دراصل اِسی کوشش کے ردِعمل کے طور پر سامنے آیا۔ اس ادب کا ایک کارنامہ تو یہی ہے کہ فنکار کا تخلیقی عمل خارج کے احکام کا تابع نہیں، بلکہ ادب ذاتی اور سماجی سچائی کا موضوعِ اظہار ہے۔ اس لئے ادب میں بنیادی اہمیت ادبی اقدار کی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نئے ادب نے اپنا نسب نامہ قدیم ادب سے جوڑا ہے اور اب اس جامع ادبی جمالیات پر اصرار کیا جانے لگا ہے۔ جس کے بغیر ادب کی سچی پرکھ ممکن ہی نہیں'' ۳

۱۹۹۰ء کے بعد نئی غزل کا جو منظر نامہ اُبھر کر سامنے آیا ہے وہ اُس نئی غزل سے بالکل مختلف ہے جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس لکھی جا رہی تھی۔ اِدھر دس پندرہ برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کی مثال انسانی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ ہم انسانی ترقی کے سب سے تیز دور سے گذر رہے ہیں۔ آج صنعت و حرفت کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے ہونے لگا ہے۔ صبح کے غم شام ہوتے ہی پرانے ہو جاتے ہیں۔ زمین سے آسمان کی طرف تحقیقی سفر ایک عرصہ پہلے شروع ہو چکا ہے۔ نظامِ شمسی کے دیگر سیاروں پر زندگی کے امکانات تلاش کیے جا رہے ہیں۔ انسان اور حیوانات کے کلون تیار ہو چکے ہیں۔ تبدیلئ جنس اور (Sex determination) کوکھ میں صنفی تعین کا چلن عام ہونے لگا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شادی سے پہلے جنسی تعلقات (Sex Relations) قائم کرنا اب کوئی معیوب بات نہیں رہ گئی۔ جسم کا ذائقہ بدلنے کے لیے تبادلہء زوجہ (Exchange of wives) کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ہم جنس جوڑوں کو شادی کرنے کا قانوناً حق دیا جانے لگا ہے۔ انٹرنیٹ پر چیٹنگ اور موبائل کے ذریعے شادیاں ہونے لگی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا (ٹی۔وی۔ موبائل سے لیکر کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک) جنسی بے راہ روی کو فروغ دینے میں جو منفی کردار ادا کر رہا ہے یہ اُسی کا اثر ہے کہ بچّے وقت سے پہلے بالغ ہونے لگے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے ہماری تہذیب و ثقافت کی جڑوں کو اندر سے پوری طرح کھوکھلہ کر کے رکھ دیا ہے۔

آئے دنوں اخبارات میں اکثر ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ ایک بھائی نے اپنی نابالغ بہن کو حاملہ بنا دیا۔ کلجگی باپ نے اپنی ہی بیٹی کی عزت کو تار تار کر دیا۔ چار بچّوں کی ماں ایک نوجوان کے ساتھ فرار۔ ایک ستّر ۷۰ سالہ بزرگ کا نابالغ لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر۔ مالک کا اپنی نوکرانی کے ساتھ بلاتکار۔ دہلی میڈیکل کالج اور راشٹرپتی بھون کے سامنے نوجوان لڑکی کے ساتھ اجتماعی زنا بالجبر وغیرہ۔

دراصل مغربی کلچر (Westren Culture) ہم پر اس قدر حاوی ہو چکا

ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی نقالی کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں
Modernism & Fashion Advancment کے نام پر ہمیں Sex
پروسا جارہا ہے اور ہمیں رفتہ رفتہ ہماری تہذیب کی جڑوں سے کاٹا جارہا ہے۔ ہماری بربادی
کے جشن منائے جارہے ہیں اور ہم خود بھی بصد شوق اپنی بربادی کے جشن میں شریک ہیں۔
لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمیں جس طرح پُر فریب اور پُر خلوص طریقے سے ہلاک کیا
جارہا ہے ہمیں اس کا احساس تک بھی نہیں ہے۔ ہو بھی کیسے؟ مغرب نے ہمارے ذہنوں تک کو
ہائی جیک کیا ہوا ہے اور ہماری سوچ پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہو چکی
ہے۔ ساری دنیا کا ایک ہی مشترکہ کلچر ہوتا جارہا ہے۔ ہائی بریڈ کے اس دور نے زندگی کی
اقدار ہی بدل کر رکھ دیں۔ ہر چیز ہائی بریڈ تیار ہونے لگی ہے۔ جانوروں کے اعضاء کو انسانی
جسم کے اعضاء کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ طاقت ور ممالک کمزور
ممالک پر قبضہ جمانے کے لیے نیوکلیائی پاور کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ بارود کے ڈھیر پر
بیٹھی یہ دنیا دِن رات تخریبی کاروائیوں میں مصروف ہے اور اب دنیا کے طاقت ور ممالک
کے مابین نیوکلیائی جنگ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی Economy کو
Capture کرنے کے لیے ذہنی جنگ بھی چھڑ چکی ہے۔ المختصر یہ کہ انسان خُدا بننے کی
کوشش میں مصروف ہے اور موت پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مقامی اور ذاتی سطح پر بھی انسان محبت سے عاری ہوتا جارہا ہے نہ اب اسے اپنوں
سے بچھڑنے کا غم ہوتا ہے نہ اپنوں کے مرنے کا رنج۔ دنیا سے بے تعلقی اور رشتوں سے بے
زاری اس کا مقدر بنتی جارہی ہے اور ذاتی خودغرضیاں اور مطلب پرستی اس کی سرشت میں
شامل ہوتی جارہی ہے۔ پیار محبت، خلوص، عاجزی، رواداری، انسان دوستی، بھائی چارہ،
خدمتِ خلق، پاک دامنی اور پاکبازی، خودداری انسان کی فطرت سے نفی ہوتی جارہی ہیں
موڈرن اِنسان غرض کی بنیاد پر وقتی تعلقات قائم کر کے مصنوعی زندگی گذار رہا ہے۔ آج دنیا

کا ہر معیار اور ہر اعتبار پیسے سے پرکھا جانے لگا ہے۔ دوستوں کی دوستی، اپنوں کا پیار پیسوں کے آگے سب ماند ہے۔ ظاہری طور پر تو آج کا انسان آرائش و زیبائش اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے خوش نما نظر آتا ہے مگر ذہنی اور باطنی طور پر بڑا بدنما اور خطرناک بن چکا ہے۔ انسانی ترقی کے نام پر اخلاقی طور پر بہت پست ہو چکا ہے۔

علاقائی تہذیبوں اور انسانی قدروں کا زوال، نئی قدروں کی تلاش و جستجو، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، سلب ہوتے ہوئے حقوق، معاشی مسائل، سیاسی مسائل، جنسی مسائل، ذاتی مفاد اور خودغرضیاں ایسے تمام مسائل و موضوعات کو پنجاب کے اُردو شاعروں نے غزل میں بڑے سلیقہ مند طریقے سے پیش کیا ہے۔

ہاتھ تو بے شک ملائیں کسی سیاست داں سے آپ
لیکن اِس کے بعد اپنی اُنگلیاں گن لیجیے

سردار پنچھی

حق نوائی کا جو دعوے دار ہے
اُس کی قسمت میں صلیب ودار ہے

رشی پٹیالوی

قتل تھا جو دیو پریوں کی کہانی میں ہوا
زندہ پھر جمہوریت کے عہدِ سلطانی میں تھا

خالد کفایت

صاف گوئی کا بھی کیا خوب نتیجہ نکلا
شہر کا شہر مرے خون کا پیاسا نکلا

انجم قادری

ہم کوئی سرمد نہیں حق بات بھی کہتے نہیں
کیوں ہمارے قتل کے احکام جاری ہو گئے

راجندر ناتھ رہبر

اِس دورِ سیاست کے کرم پوچھ نہ ہم دم
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

(طالب شملوی)

سیاست دان سے ہاتھ ملانے سے پہلے اپنی انگلیاں گِننا، حق نوائی کے دعوداروں کی قسمت میں صلیب دار ہونا، دیو پریوں کی کہانی میں قتل ہونے والے دیو کا عہدِ جمہوریت میں پھر زندہ ہو جانا، صاف گوئی پر تمام شہر کا خون کا پیاسا نکلنا، سرمدؔ کی طرح حق بات نہ کہنے پر بھی قتل کے احکام جاری ہونا، اہلِ سیاست کی کرم فرمائیوں کے باوجود اپنے آپ کو زندہ رکھنا، یہ وہ شعری رویّے ہیں جو ہمارے عہد کی سیاست اور اُس کی سازشوں کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس میں سب سے مشکل کام تعلقات کا نبھانا اور اُنھیں قائم رکھنا ہے۔ یہ زمانہ اس قدر حسّاس اور اَنا پرست ہو چکا ہے کہ اِسے مذاق میں کہی گئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بڑی ناگوار گذرتی ہے۔ یہ تنگ ذہنیت ہی کا اثر ہے کہ آج کا انسان ذراسی بات پر برسوں کے تعلقات منقطع کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اُسے نہ اپنوں کے روٹھنے کا غم ہوتا ہے اور نہ روٹھوں کو منانے کی فِکر۔ کشادہ قلبی اور فراخ دِلی گزرے زمانے کی باتیں ہوگئی ہیں ایسے میں انسانی تعلقات ریشمی دھاگوں سے کم نازک نہیں ہیں کہ جنھیں کانٹوں میں الجھنے پر بہت آہستہ نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے اور صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ ذراسی لاپرواہی اور ناسمجھی برسوں کے تعلقات کو آن کی آن ختم کرسکتی ہے۔ انسان جن کو چمن کا حسن سمجھتا ہے بعض اوقات وہ پھول بھی خار نکلتے ہیں۔ اِس دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ انسان کو جیتے جی اپنے پرائے کی پہچان نہیں ہو پاتی مرنے کے بعد ہی اپنوں اور بیگانوں کی حقیقت کُھل کر سامنے آتی ہے۔ ناساز حالات میں قریبی سے قریبی رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ بالخصوص وہ تمام تعلقات جن کی بنیاد موسموں پر ہوا کرتی ہے خزاں کے موسم میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن قدرت نے انسان کو مشکل سے مشکل حالات

سے لڑنے کا وہ مادہ عطا کیا ہے اور سخت سے سخت امتحان سے گزرنے کی وہ صلاحیت اور ہمت عطا کی ہے کہ انسان باوجود اپنی بشری کمزوریوں کے ہر منزلِ امتحان سے سُرخرو گزر جاتا ہے۔ زندگی کی زلف کتنی بھی پریشاں کیوں نہ ہو وہ اپنی جواں مردی صبر و تحمل اور سلیقہ مندی سے اُسے سلجھا ہی لیتا ہے اور یہی زندگی گزرنے کا اصل فن ہے۔

کانٹوں میں الجھ جائیں تو آہستہ نکالو
رشتوں میں کہیں ریشمی دھاگے بھی لگے ہیں

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

چمن کا حسن سمجھ کر سمیٹ لائے تھے
کسے خبر تھی کہ ہر پھول خار نکلے گا

کالی داس گپتا رضا

اپنے بیگانے کی پہچان تو ہو جائے گی
میرے مرنے کی خبر آج اُڑا دی جائے

طالب شملوی

یہ چاہیے کہ کریں غور پھر سے رشتوں پر
علاج درد کا ترکِ تعلقات نہیں

ستنام سنگھ خمار

اگر حالات ہوں ناساز رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
خزاں آتی ہے تو پیڑوں کے پتے ٹوٹ جاتے ہیں

گوردیال سنگھ عارف

اُس کو سُلجھاؤ سلیقے سے، سُلجھ جائے گی یہ
زندگی کی زلف کتنی بھی پریشاں کیوں نہ ہو

عارف

دنیا کا دستور بھی عجب ہے۔ یہ پتھروں کو خدا مانتی ہے اور انسانوں کو ٹھکراتی ہے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا جب ہر طرف گُنہ گاروں کی بھیڑ ہو تو ایسے میں کون ہے جو دوسروں کے پہلا پتھر مارنے کی بات بھی سوچ سکے۔ یہاں سب کے سب گنہ گار ہیں اور سبھی کے ہاتھوں میں پتھر بھی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آنگن میں پتھر ہم سائے نے ہی پھینکے ہیں، غیر کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے ہم سائے پر کوئی شُبہ نہ کرنا اپنے ہم سائے سے تعلقات استوار رکھنے کا خوبصورت اور غیر انتقامی جذبہ ہے۔ غیر کے ہاتھوں زخم کھانے کا انسان کو کوئی غم نہیں ہوتا لیکن غم تب ہوتا ہے جب آدمی کو یہ پتہ چلتا ہے کے پتھر مارنے والے اور زخم دینے والے کوئی غیر نہیں بلکہ اُس کے اپنے ہی احباب ہیں۔ احباب سے ملنے والا زخم روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ جس کی تاب لے آنا ہر حساس فرد کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو پتھروں میں رہتے رہتے خود بھی پتھر بن گیا ہو اور جس کے اندر کا اِنسان مرچکا ہو۔

چار سو میں دیکھتا ہوں اب گُنہ گاروں کی بھیڑ
کون کس کے آج مارے پہلا پتھر دوستو

کرشن ادیب

وہاں انسان ٹھکرائے گئے کیوں
جہاں پتھر خُدا مانے گئے ہیں

آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر

غیر کی سازش ہی سے پتھر آئے ہیں میرے آنگن میں!
تم پر شُبہ کروں تو کافر، تم تو میرے ہم سائے ہو

ساحر ہوشیار پوری

زخم کھانے کا کِسے غم ہے، ہمیں غم ہے تو یہ
جس طرف سے آئے تھے پتھر اُدھر احباب تھے

آزاد گورداسپوری

پتھروں میں میں، بھی پتھر بن گیا
وہ جو مجھ میں اِک بشر تھا مر گیا

ہرجیت فانیؔ

ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اور جو سماج ہمیں میسّر ہے اُس میں ہر طرف باطل ہی کی حکومت ہے۔ ایسے میں آدمی کو یہ یقین ہونا کہ حق بجانب ہونے پر بھی فیصلہ اُسی کے خلاف ہوتا ہے کوئی خلافِ توقع واقعہ نہیں ہے۔ دنیا میں ہر طرف قتل و غارت دیکھ بعض اوقات ایسا گمان بھی گزرتا ہے کہ اب شاید خُدا نہیں رہا۔ ایسے میں اگر کوئی شخص خدمتِ انسانیت کے جذبے سے دوسروں کے لیے جینا بھی چاہتا ہے تو یہ دنیا بڑی سفّاکی سے اُس کا قتل کر دیتی ہے قتل بھی اِس سلیقے سے کیا جاتا ہے کہ آستین پر خون کا دھبّہ تک دِکھائی نہ دے۔ لیکن افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ سرِ عام قتل ہونے پر بھی کوئی قتل کی گواہی نہیں دیتا۔ یہ محض کوئی تخّیل یا مضمون آفرینی نہیں ہے بلکہ وہ سچّے مشاہدات اور تلخ و دل سوز تجربات ہیں جو پنجاب کی نئی غزل میں در آئے ہیں۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل، اپنوں کی ناقدری، دوستوں کی بے وفائی، سیاست کی جعل سازیاں یہ تمام وہ رویّے ہیں جو ہمارے عہد کی پہچان بن چکے ہیں۔

ہوں میں ہی حق پہ مگر یہ بھی ہے یقیں دِل کو
یہی کہ فیصلہ میرے خِلاف ہوتا ہے

محمودؔ عالم

ہرطرف ہے قتل و غارت ہر طرف چیخ و پکار
آج دنیا میں کہیں پر ہے خُدا لگتا نہیں

کرشن پرویزؔ

لوگوں نے آج مِل کے اُسے قتل کر دیا
اِک شخص جی رہا تھا زمانے کے واسطے

سلیم زبیری

ایک دھبہ تک نہیں ہے آستیں پر خون کا
قتل کرنے کا مجھے اُن کا سلیقہ دیکھئے

رنگ یحییٰ پوری

صد حیف کوئی اس کی گواہی نہیں دیتا
ہرچند کہ یہ قتل سرِ عام ہوا ہے

محسن عثمانی

یہ پنجاب کی نئی غزل کا مثبت رویّہ ہی ہے کہ زمانے میں پھیلے ہوئے انتشار اور بدامنی کے باوجود بھی تمام ہندوستان کے شعراء کی طرح پنجاب کے اُردو شعراء نے بھی رنگ و نسل اور مِلّت کے حصاروں کو توڑ کر جذبہء انسانیت کو جگانے کی بات کی ہے۔ لیکن اُن کا یہ جذبہ محض نعرہ نہیں ہے اور نہ ہی پنجاب کے اُردو شعراء نے کبھی تہذیب کی حدوں کو توڑا۔ امنِ عالم کا پیغام انھوں نے محبت ہی کے شیریں الفاظ میں پیش کیا ہے۔ تلخ کلامی اور شعبدہ بازی سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ دنیا کو امن کا پیغام وہی شخص دے سکتا ہے جِسے یہ علم ہو کہ جنگ زیادہ دیر نہیں چل سکتی اور آخر کار امن ہی جنگ کا حل نکلے گا۔ پنجاب کے شاعروں نے جہاں ساری دنیا کے لیے انسانیت کے فروغ کی بات کی وہیں اُنھیں یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں آج کا یہ انسان اِس دنیا کو پل بھر میں ختم ہی نہ کر دے کیوں کہ ترقی کے نام پر تباہی پھیلانے والے اِس انسان کو یہ بھی معلوم کہ اس زمین کے بعد ابھی آسمان باقی ہے یعنی ترقی کے نام پر تباہیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ صد افسوس دُنیا نے بشر سے جو توقعات اور امید وابستہ کر رکھی تھیں اُن پر یہ بشر پورا نہیں اُترا۔ ہماری زندگی اور موت آج کے ترقی یافتہ انسان کے غیر محفوظ ہاتھوں میں قید ہے۔ خدائی کا دعویٰ کرنے والا یہ انسان نہ جانے کب ساری دنیا کو موت کی نیند سُلا دے۔

نسل و ملّت کے حِصاروں کی فصلیں توڑ کر
جذبہ ء انسانیت کو بھی جگانا چاہیے

ندیم پرمار

جنگ کہاں تک چل سکتی ہے
امن ہی آخر حل نکلے گا

پورن احسان

زمیں کو پھونک کے دم لیں گے کیا زمیں زادے
انہیں پتہ ہے ابھی آسمان باقی ہے

آزاد گلاٹی

افسوس بہت ہے کہ یہ پورا نہیں اُترا
اُمید بہت رکھی تھی دنیا نے بشر سے

کرشن پرویز

دل بہت تنگ ہیں مکینوں کے
گھر کا آنگن بہت کشادہ ہے

سلطان انجم

انساں کے ہاتھ میں ہے ہماری حیات و موت
انسان اس جہاں کے خُدا ہوگئے ہیں آج

ناظر صحرائی

کیا انا کی دھوپ سی بکھری ہوئی ہے چار سو
ذات کے سائے میں گویا رینگتے پھرتے ہیں لوگ

متر نکودری

کھا جائے گا یہ جان کو آزارؔ دیکھنا
پہروں کسی کو صورتِ دیوار دیکھنا

پریم کمار نظر

فقط مطلب پرستی کو نظر کے سامنے رکھا
نہیں دیکھی کسی مجبور کی مجبوریاں ہم نے

عابد سامی

یہ بھی آج کے دور کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب کوئی انسان کسی کے بھلے کی دُعا مانگتا ہے تو پسِ دُعا اپنی ہی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔ خُدا کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذات کو بھی فریب دینا دُنیا کا صدیوں پُرانا رویہ رہا ہے۔ لیکن یہ رویّہ بھی پنجاب کی نئی اُردو غزل میں اپنے نئے معنی اور نئے ابعاد میں ظاہر ہوا ہے۔ انسان کا اچھا یا بُرا ہونا دراصل آج کے دور ہی کی پہچان ہے۔ انسان جب اِس دنیا میں آتا ہے تو وہ معصوم اور بے گناہ ہوتا ہے۔ خود اُس کا دور ہی اُسے اچھا یا بُرا بننے پر مجبور کرتا ہے۔ جیسے جیسے ہم ترقی کرتے جارہے ہیں اپنی تہذیب کی جڑوں سے کٹتے جارہے ہیں۔ پودوں کو سینچنے کے بعد اُن سے کسی قسم کی کوئی آس نہ رکھنا آج کے دور کے اخلاقی اور انسانی زوال کا اِشاریہ ہے۔ یہ انسانی زوال ہی کا اثر ہے کہ بشر اپنے غم خانے میں سمٹ کر خود کو خُدا کی مانند تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ بند کمرے میں اُس کا دم گھٹتا ہے اور کھڑکیاں کھولنے پر زہریلی ہوا اندر آتی ہے۔ ایسے حالات میں راہِ نجات کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنی بھلائی سے تھی غرض
ہم لوگ دوسروں کا بھلا مانگتے رہے

جگر جالندھری

اُن سے کوئی آس نہ رکھ
جن پودوں کو پانی دے

آر۔ڈی۔ شرما تاثیر

میں بھلا ہوں یا بُرا انسان ہوں
آپ کے اِس دور کی پہچان ہوں

ڈاکٹر نریش

بند کمرے میں مری سانس گھٹی جاتی ہے
کھڑکیاں کھولوں تو زہریلی ہوا آتی ہے

جگر جالندھری

روز و شب سنجیدہ رہنا مشکل ہے
تیرے گھر میں میرا رہنا مشکل ہے

مہیش پٹیالوی

اب تیرے غم کے پیمبر بھی میرے ساتھ نہیں
اپنے غم خانے میں تنہا ہوں خُدا کی مانند

اسلم حبیب

اے زیست تجھے میں بھی اگر بھول چُکا ہوں
تو بھی تو مجھے رکھ کے کہیں بھول گئی ہے

اجیت سنگھ حسرت

تکلّف برطرف ہر دِن نیا غم لے کے آتا ہے
بہت مشکل ہے اس دنیا میں جینا آپ کا ہوکر

راجندر ناتھ رہبر

شجر نے پھل دیئے، لکڑی دی، سائبان دیا
اکیلی جان نے کیا کیا نہ اِمتحان دیا

امرت پال سنگھ شیدا

سمندر پار کرکے اب پرندے گھر نہیں آتے
اگر واپس بھی آتے ہیں تو لے کر پر نہیں آتے

سوہن راہی

میں بھی پابندِ وفا رہ کے بھلا کیا کرتا
جب زمانے نے محبت کا چلن چھوڑ دیا

ناشر نقوی

فریب اتنے ملے ہیں ہم نواؤں، ہم پیالوں سے
کہ اب مسرور اپنے قلب و جاں سے خوف لگتا ہے

مسرور لکھنوی

اِن کو روٹی نہیں وعدوں کے کھلونے دیدو
لوگ ان پڑھ ہیں بہل جائیں گے بہلانے سے

محسن عثمانی

مہکائے رکھتی ہے آنگن، خوشبو تیرے وعدوں کی
بارش برسے یا نہ، برسے ابر تو چھایا رہتا ہے

رمضان سعید

تیرے کرم کی مجھ کو شکایت ہے اس لیے
تیرا کرم فریبِ کرم ہے، کرم نہیں

عاجز جالندھری

میں ڈوبتے میں سہارا تو اُس کا لے لیتا
وہ بات بات پہ احساں جتانے والا تھا

انوار آذر

زمانے کو رہیں گے یاد صدیوں!
یہاں جو حادثے اب ہو رہے ہیں

ساحر ہوشیار پوری

وقت کے ساحل پہ ننگے پاؤں ہم
چُن رہے ہیں حادثوں کی سیپیاں

مشتاقؔ وارثی

جسموں کی نمائش ہے ، بازارِ محبت میں
اے نازؔ ! کہاں کی یہ تہذیب و ترقی ہے

نازؔ بھارتی

نئی نسل ترقی اور روشنی کے نام پر جہاں میں اندھیرا پھیلا رہی ہے۔ترقی اور روشنی کے سفر کا انداز یہ ہے کہ سڑکوں پر تو اُجالا ہے لیکن ذہنوں میں تاریکی چھائی ہوئی ہے جب اِدراک کی راہوں میں ہی اندھیرا ہو تو زندگی میں روشنی کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اشتہار بازی کے اس دور میں ہر طرف نمائش کا دور دورہ ہے۔محبت جیسا پاک جذبہ بھی اب نمائش اور دکھاوے سے بچا نہیں ہے چھل کپٹ اور مکروفریب کے اس دور میں جب لوگوں سے کسی بھی بات پر دل نہ ملتا ہو اُن سے ہاتھ ملانے کا تکلّف بھی کیوں گوارا کیا جائے۔۔۔۔! جب تک انسان کے اندر اُس کا احساس زندہ ہے، اُس کی خودداری زندہ ہے تو انسان زندہ ہے۔ جب احساس مرتا ہے تو نہ صرف احساس مرتا ہے، خودداری مرتی ہے اور آدمی کے اندر کا انسان بھی مر جاتا ہے۔آدمی کا احساس ہی اُس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔

نئی روشنی کے یہ دیوانے یا رب
جہاں میں اندھیرا کئے جا رہے ہیں

دِلؔ کاشمیری

ہو زندگی میں روشنی کا کس طرح گذر
اِدراک کی راہوں میں اندھیرا ہے اِن دنوں

ستیہ پال مہلوترہ عارفؔ

خوشبو شناس ہونے کے دعوے فضول تھے
آنکھیں کھلیں تو ہاتھ میں کاغذ کے پھول تھے

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

کسی بھی بات پر جن سے یہ دل نہیں ملتا
اب ایسے لوگوں سے ہم ہاتھ بھی ملائیں کیا

انوار آذر

تیرا احساس علامت ہے تیرے جینے کی
تو کبھی خود سے ہوا دور تو مر جائے گا

سدرشن کنول

گہری سیاہ شب میں جو راہرو ہے تیز گام
سورج کو بھی ہے اُس کے اِرادوں کا احترام

سدرشن کنول

میں تو گھر میں بھی بہت دور رہا ہوں گھر سے
مجھ کو بن باس کی عادت ہے ڈراتے کیا ہو

بی۔ایل۔رتن

زباں بندی سے حاصل کچھ نہ ہوگا
خموشی اور اونچا بولتی ہے

آر۔ڈی۔شرما تاثر

دل کے آئینوں کو کیوں صاف نہیں رکھتے ہم
اپنے ہی سامنے آتے ہوئے ڈرتے کیوں ہیں

شرون کمار ورما

ہماری تہذیب یہ رہی ہے کہ ہم بڑے ہونے پر بھی اپنے بڑوں اور بزرگوں سے ڈرا کرتے تھے اُس وقت ہمارے گھروں کی عجب شان ہوا کرتی تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے زمانے کی قدریں بدل گئی ہیں۔ تہذیب بدل گئی ہے۔ اب گھر کے بڑوں سے ڈرنا تو دور کی بات رہی، بچے پلٹ کر جواب دیتے ہیں۔ اور ذرا سی بات پر بغاوت کر دیتے ہیں۔ گھر سے جاتے ہیں تو پلٹ کر نہیں آتے۔ بچے بچپن ہی میں سیانے ہونے لگے ہیں۔ اب اُن کا دل کھلونوں سے نہیں بہلتا۔ وہ ہائی پروفائل زندگی کے خواب دیکھتے ہیں۔ گھروں کی ویرانی کا یہ عالم ہے کہ کمروں کے اندر ہر چیز سجی ملتی ہے لیکن لوگ گھروں کے اندر ٹوٹ کے بکھرے ہوتے ہیں۔ زندگی ہر قدم پر کربلا کا منظر پیش کرتی ہے۔ مے کدوں کے باہر پیاس کا ماتم ہے۔ نیلے سمندر جوان ندیوں کو نگل رہے ہیں۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا رہی ہیں۔ لوگ ہر روز صبح کھرے بن کر گھر سے نکلتے ہیں اور شام ہوتے ہی کھوٹے سکّے کی طرح لوٹ آتے ہیں۔ یہ وہ سچائیاں ہیں جن کا خوبصورت اظہار پنجاب کی نئی اُردو غزل میں شدّت سے ہوا ہے۔ اِن شعری رویّوں میں جہاں پنجاب کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہیں جدید ترین ذہن کی سانسوں کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

پتّے پیڑ سے رشتہ توڑ کر بہت خوش ہیں
شاید ان کی پت جھڑ سے دوستی زیادہ ہے

ڈاکٹر سلطان انجم

عجب اک شان تھی اپنے گھروں کی
ڈرا کرتے تھے چھوٹے جب بڑوں سے

ڈاکٹر محمد رفیع

میں زیست بس اتنی تقسیم میں گذارتا ہوں
جہاں میں کیا مجھے حاصل نہیں ہے کیا حاصل

کرشن کمار طور

کھلونے دیکھتا ہے چیختا ہے !!
وہ بچپن ہی میں بوڑھا ہوگیا ہے !!

پروین کمار اشک

سارا جہان آپ کے قدموں میں آئے گا
خود کو ذرا وقت کے سانچے میں ڈھال دو

کرشن پرویز

باقی تو ہر چیز سجی ہے کمروں کی
لوگ گھروں کے اندر ٹوٹ کے بکھرے ہیں

ظفر احمد ظفر

ندّی بہت جوان بہت تیز رو سہی
لیکن اُسے بھی نیلے سمندر نگل گئے

عارف حلیم

نہ ساحلوں پہ یقیں ہے نہ زور طوفاں پر
تلاش کرتی ہوں تنکے کا آسرا میں بھی

روبینہ شبنم

مری مجبوریاں تو' جانتا ہے
مری جانب سے دِل میلا نہ کرنا

آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر

ہر قدم پر زندگی ہے کربلا ہی کربلا !
مے کدے سے اُٹھ کے باہر پیاس کا ماتم بھی دیکھ

کرشن ادیب

لوٹ آئے کھوٹے سکّے کی طرح
گھر سے نکلے تھے کھرے بن کر بہت

ریاضؔ خلجی

صرف اِک مجھ کو گرانے کے سبب
لوگ خود گرتے گئے معیار سے

ششی بھوشن چراغؔ

کر کے کمزور پہ طاقت کو عیاں وہ اپنی
ساری دنیا کی حکومت کو چلانا چاہے

مکرّم سیفی

شعلے اِدھر اُٹھے تو اُدھر بھی لگے گی آگ
یوں مُنسلک ہے گھر کسی کا میرے گھر کے ساتھ

ستنام سنگھ خمارؔ

سمندر چیختا اُس وقت پہنچا
مکاں پوری طرح جب جل چکا تھا

پروین کماراشکؔ

میں دشمنی کا سہانا جواب لکّھوں گا
دِلوں کو جوڑنے والی کتاب لکّھوں گا

پورن احسانؔ

ہم وطنوں نے دھرتی دریا بانٹے تھے
پر اب تک روتا ہے پانی نہروں کا

پورن احسانؔ

پھولوں کی طرح جس کی مہک چاروں طرف تھی
شعلوں میں وہ پنجاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

جگر جالندھری

خوشی سے ماں کو کہاں کچھ سُجھائی دیتا ہے
جو بیٹا ہاتھ میں پہلی کمائی دیتا ہے

پورن احسان

ہر شاعر و ادیب کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ اپنی الگ ایک سوچ ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ دنیا اور اپنے سماج میں بکھری ہوئی سچائیوں کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔ حالات اور واقعات کے مکمل فہم و ادراک کے بعد وہ اُن حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں تخلیقی کرب سے گزر کر صفحہء قرطاس پر لے آتا ہے۔ تجربات کی تیز آنچ پر تیار ہونے والا ادب ہی زیادہ پائیدار اور مقبولِ خاص و عام ہوتا ہے۔ پنجاب کی نئی اُردو غزل کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو کسی بھی لحاظ سے ہندوستان میں کہی جانے والی غزلیہ شاعری سے کم نہیں ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر ہمارے پنجاب کے اُردو شعراء نے اِنھیں ادبی رسائل و جرائد میں چھپوانے کی زحمت اُٹھائی ہوتی اُن کے یہ آفاقی اشعار آج زبان زدِ خاص و عام ہوتے۔

حوالے

حوالہ نمبر	کتاب / رسالہ	مصنف	صفحہ
۱۔	غزل کا نیا منظر نامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	۵۲۔۵۳
۲۔	غزل کا نیا منظر نامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	۶۵۔۶۶
۳۔	جدیدیت کے بنیادی افکار گوپی چندنارنگ ماھنامہ ''تحریک'' دھلی ۲۰۰۰ء	گوپی چندنارنگ	

پنجاب میں اُردو غزل کا مستقبل

اُردو غزل کا مستقبل اُردو زبان کے مستقبل سے جڑا ہوا ہے۔ اُردو غزل کے مستقبل کے بارے میں بات کرنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اُردو زبان کے مستقبل کی بات کی جائے۔ اس سلسلے میں ماضی اور حال کے حوالے ہی سے صحیح نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ پنجاب کی اُردو غزل کے عمیق مطالعے سے یہ بات واضع طور پر سامنے آئی ہے کہ آزادی سے پہلے مشترکہ پنجاب میں اُردو غزل کی روایت بڑی جاندار اور شاندار رہی ہے۔ جس کی اصل وجہ پنجاب میں اُردو کے ماحول کا ہونا تھا۔ سبھی اسکولوں اور کالجوں میں اُردو کی تعلیم لازمی تھی۔ عدالتوں اور تمام سرکاری اداروں کے کام اُردو رسم الخط میں ہی ہوا کرتے ہیں۔ اُردو سرکاری اور درباری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ کاروباری زبان بھی تھی۔ پنجاب کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے نوے فیصد اخبارات اُردو میں ہی شائع ہوا کرتے تھے۔ لوگ بلا امتیاز مذہب وقوم اُردو پڑھتے لکھتے اور بولتے تھے۔ خط وکتابت بھی اُردو ہی میں ہوا کرتی تھی۔

پنجاب کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ ''انجمن پنجاب'' ایسی ادبی انجمن کا قیام سب سے پہلے لاہور میں عمل میں آیا وہیں اس بات پر بھی فخر ہے کہ آزادی سے پہلے سب سے زیادہ ادبی انجمنیں اِسی سرزمین پر قائم ہوئیں۔ غیر منقسم پنجاب میں لاہور ہی سب سے بڑا ادبی مرکز تھا۔ جہاں بے شمار انجمنیں قائم تھیں اور شعروسخن کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ لاہور ہی میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انگریزی ادب سے اثر قبول کرنے کے بعد اُردو شاعری میں جدید راہیں تلاش کررہا تھا۔ اس گروہ نے اپنے لئے ایک الگ اور نئی انجمن قائم کی اور اس کا نام ''نیاز مندانِ لاہور'' رکھا۔ اس انجمن کے روحِ رواں تھے، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور اس

میں شامل ہونے والے شاعروں اور ادیبوں میں حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، پنڈت ہری چند اختر، صوفی گلام مصطفٰی تبسم، چراغ حسن حسرت اور حکیم احمد شجاع وغیرہ کے نام اُردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

لاہور ہی کے چند دانشورانِ علم و ادب نے ایک بزم ''بزم داستان گویاں'' کے نام سے قائم کی جو آگے چل کر ''حلقہء ارباب ذوق'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس بزم کی نشستیں اِس سے وابستہ افراد کے گھروں پر ہی اتوار کو منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اس بزم کے تحت منعقد ہونے والے جلسوں میں اصنافِ ادب کی جو بھی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں، اُن پر تنقید ہوا کرتی تھی۔ اس حلقہء کے سرگرم ارکان ن۔م۔ راشد، میراجی، حفیظ ہوشیار پوری، مولانا صلاح الدین، تابش صدیقی، تصدیق حسین خالد، قیوم نظر، یوسف ظفر، ناصر کاظمی، یوسف علی عابد، راجندر سنگھ بیدی، کنھیالال کپور، اوپندر ناتھ اشک، شیر محمد اختر، اعجاز حسین بٹالوی، انتظار حسین اور سیّد امجد حسین تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ آزادی سے پہلے پنجاب میں اُردو کا بول بالا تھا۔ لوگ اُردو سے محبت کرتے تھے ملکی تقسیم کا سب سے زیادہ اور بڑا نقصان اُردو کا ہوا۔ دونوں طرف کے پنجاب تو از سر، نو آباد ہو گئے، لیکن اُردو آج تک آباد نہیں ہو سکی۔ تقسیم کے وقت جو نفرت کا خونی اور زہریلا ماحول پیدا ہوا، اُس کا خمیازہ اُردو کو بھگتنا پڑا۔ مذہبی منافرت اور جنون کی وجہ سے اُردو لسانی تعصب کا شکار ہوئی اور تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سے (جس میں ہریانہ اور ہماچل پردیش بھی شامل تھا) اُردو کو تعلیمی نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ اس طرح آنے والی نسلیں اُردو کی تعلیم سے محروم کر دی گئیں۔ اُردو کی جگہ ہندی اور پنجابی نے لی۔ افسوس اس بات کا نہیں کہ سرکاری کام اُردو میں ہونا بند ہو گئے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اُردو کو سکولوں اور کالجوں کے نصاب سے یکسر ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے اس عتاب کا اثر پنجاب میں اُردو زبان و ادب کے فروغ بالخصوص اُردو غزل پر بھی پڑنا تھا۔

دراصل ملکی تقسیم کا اُردو کو دُہرا نقصان اُٹھانا پڑا۔ ایک تو یہ کہ اُردو کو تعلیمی نصاب

سے ختم کر دیا گیا۔ دوسرے تقسیم کے وقت اُردو کی پرانی نسل جن میں اچھی خاصی تعداد ادیبوں اور شاعروں کی بھی تھی پاکستان ہجرت کر گئی۔ جو لوگ پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پنجاب کو اپنا مستقر بنایا۔ اُن کی نسلیں اُردو سے بے بہرہ ہو گئیں یا پھر انھوں نے دانستہ طور پر اپنی آئندہ نسل کو اُردو سے دور رکھا۔ ظاہر ہے اس کا اثر پنجاب میں اُردو زبان وادب کے فروغ بالخصوص اُردو غزل پر بھی پڑا۔ آزادی کے بعد پچیس تیس سال تو اُردو غزل کی بقا اور روایت کو زندہ رکھنے کے لئے پنجاب میں پرانی نسل کا ایک حصہ اس سر زمین پر سرگرم عمل رہا۔ جن میں لبھو رام جوش ملسیانی، پنڈت میلا رام وفا، رتن پنڈوروی ،کمال مالیر کوٹلوی اور نو بہار صابر نے نہ صرف یہ کہ ادبی مرکز اور انجمنیں قائم کی بلکہ اُردو غزل کے لئے ایک نئی نسل بھی تیار کی۔ ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس کا ذکر آزادی کے بعد پنجاب میں اُردو غزل کے باب میں آ چکا ہے۔ پنجاب میں داغؔ اسکول کے نمائندہ اور مُستند شاعر حضرتِ جوش ملسیانی تھے۔ جنھوں نے داغ اسکول کی روایت کو پنجاب میں زندہ رکھا اور اپنے شاگردوں کو بھی داغ کی روایت کو سلیقے سے نبھانے کی تعلیم دی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پنجاب کے شاعروں نے داغؔ کی فکر کو نہیں فن کو اپنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے بہت سے شعراء کے کلام میں داغؔ کے کلام کی سی سادگی، روانی، زبان کی صفائی، سلاست اور پُرکاری بدرجہ اتم موجود ہے۔

پنجاب نے دلّی لکھنؤ اسکول کی شاعری سے مرعوب ہوئے بغیر اُردو شاعری کو مالا مال کیا ہے۔ دبستان، لاہور نے تقسیم سے پہلے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ علامہ اقبال سے فیضؔ تک ایسے فطری شاعر ہوئے ہیں جن کے بغیر اُردو شاعری کی بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ جناب جوشؔ ملسیانی نے حضرتِ داغؔ کے انداز کی غزل کو پنجاب میں نہ صرف زندہ رکھا بلکہ گھر گھر پہنچا دیا۔ آج بھی داغ اسکول کے بزرگ شاعر اُردو غزل کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ زبان و بیان، محاورات، معاملات، حسن و عشق اور کلاسیکیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد کچھ سال ایسے گزرے کہ اُردو زبان اندھیروں میں جا ڈوبی۔ لیکن

اب پھر اس میں زندگی کی رمق جاگی ہے۔ اس کو تیز کرنے کے لئے ہمیں حکومت کا مُنہ دیکھنا چھوڑنا ہوگا۔ پچھلے پچاس برسوں میں پنجاب میں اُردو غزل نے پھر زندہ ہونے کا ثبوت دینا شروع کیا۔

بڑے پیانے پر نہ سہی لیکن کہیں نشستوں، کہیں مشاعروں کی صورت میں غزل لوگوں میں مقبول ہورہی ہے۔ شعری مجموعے شائع ہورہے ہیں، پنجاب کے تقریباً ہر شہر، ہر قصبہ میں دو چار اُردو شاعر اپنے ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ یہ بات پنجاب کی اُردو غزل کے حق میں بڑی خوش آئندہ بات ہے ہر چند کہ پرانی نسل کے نمائندہ شاعر ایک ایک کر کے دنیا سے اُٹھتے جارہے ہیں۔ پرانی نسل کے بعد کی نسل اس تلخ حقیقت سے خوب واقف ہے اور وہ پنجاب میں اُردو غزل کی روایت کو زندہ رکھنے اور نئی نسل تک پہنچانے میں لگی ہوئی ہے۔ پٹھان کوٹ میں استاد شاعر جناب راجندر ناتھ رہبر اور جدید غزل کے نمائندہ شاعر پروین کمار اشک نئی نسل کی آبیاری کررہے ہیں۔

لدھیانہ میں سردار پنچھی اور نامی نادری شعروسخن کی شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ پٹیالہ میں نوبہار صابر کے بعد اُن شاگردِ رشید مہیش پٹیالوی نے یہ ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ پٹیالہ ہی میں پروفیسر ناشر نقوی اُردو کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ شعروادب کے سلسلے میں بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مالیرکوٹلہ پنجاب کا واحد ایسا شہر ہے، جو تقسیم کے کرب سے محفوظ رہا۔ ۱۹۴۷ء کے وقت اکا۔ دُکا لوگوں نے پاکستان ہجرت ضرور کی مگر شہر کی مجموعی آبادی نے نواب مالیرکوٹلہ کے ساتھ یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس تاریخی فیصلہ کے پیچھے بہت سے سیاسی اور مذہبی عوامل کام کررہے تھے۔ جن کا ذکر ریاستِ مالیرکوٹلہ اور پنجاب کی سکھ تاریخ میں بڑی وضاحت کے ساتھ ہوا ہے۔ آزادی کے بعد مالیرکوٹلہ ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں پرائمری سے لے کر ایم۔ اے کی سطح تک اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے اور شہر کے زیادہ تر سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں اُردو اختیاری اور لازمی مضمون کے طور پر بھی نصاب تعلیم میں شامل ہے۔ اس شہر میں اُردو پڑھنے لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ شہر پنجاب میں اُردو زبان و

ادب کا گہوارہ ہے۔ یہاں بے شمار ادبی تنظیمیں اور انجمنیں شعر و ادب کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں۔ نظم ہو یا نثر یہاں کے قلم کار ہر میدان میں پیش پیش ہیں۔ آزادی سے پہلے اور فوراً بعد جہاں استاد کمالؔ مالیر کوٹلوی اور منظور حسن نامیؔ نے ایک نسل کی تربیت کی وہیں بعد کی نسل میں مرحوم خالدؔ کفایت نے غزل کہنے والوں کی ایک کھیپ تیار کی اور انھیں غزل کے فنی رموز سکھائے۔ خالد کفایت کے علاوہ اُن کے ہم عصر انوار آذرؔ، ڈاکٹر اسلم حبیب، انجم قادری اور پروفیسر محمود عالم بھی نئی نسل کی تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اِن اساتذہ کی مساعی جمیلہ کا ہی ثمرہ ہے کہ مالیر کوٹلہ میں شعر و سخن کا ماحول زندہ ہے۔ ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر روبینہ شبنمؔ اور ڈاکٹر سلیم زبیری نوجوان نسل کے وہ نمائندہ شاعر ہین جن کا نام پنجاب میں نئی اُردو غزل کے حوالے سے اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ معیاری غزل لکھنے والے نوجوان شاعروں کی فہرست بھی بڑی طویل ہے ۔ اس سلسلے میں ساجد اسحاق، ضمیر علی ضمیرؔ، شیخ افتخار حسین، اجملؔ خاں شیروانی، سالکؔ جمیل براڑ، اختر جوشؔ، مشتاق جوشؔ، انوار انجمؔ، عمر فاروقؔ، محمد اشرفؔ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اُردو غزل کے یہ نئے چراغ اخبارات و رسائل کے ذریعے اپنے ہونے کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔

اِک وہ کہ اس کے آنے میں کچھ اور دیر ہے
اور پھول ہے کہ سوکھتا جائے ہے ڈال کا

روبینہ شبنمؔ

کیا عجب طور سے لوٹا ہے کسی نے دِل کو
کہ گیا کچھ بھی نہیں اور بچا کچھ بھی نہیں

محمد رفیع

ہم نے خود سے بھی کچھ نہیں چاہا
تجھ سے پھر کیا سوال کرنا ہے

ظفرؔ صدیقی

جوانوں کی غلط سمتی کے پیچھے
بزرگوں کی خطائیں چل رہی ہیں

سلیم زبیری

لوگ ہر منزل پہ دم لیتے رہے
میں چلا ساجدؔ تو بس چلتا رہا

ساجدؔ اسحاق

ندی بہت جوان بہت تیز رو سہی
لیکن اُسے بھی نیلے سمندر نگل گئے

عارفؔ حلیم

یہ میری ماں کی دُعاؤں کا اثر ہے شاید
میرا کشکول جو بن مانگے ہی بھر جاتا ہے

ضمیرؔ علی ضمیر

مشکل سے ہو رہا ہے گزارا بھی اِن دِنوں
اُن کو مرے لباس پر کیا کیا گمان ہے

انوارؔ احمد انصاری

ہوائیں تھیں کہ مسلسل خلاف چلتی رہیں
چراغ بجھتے رہے اور میں جلاتا رہا

شیخ افتخار حسین

وہ ایک آگ کا دریا میں کاغذی کشتی
یہ دیکھ کیسے اُسے پاکر لیا میں نے

اجملؔ خاں شیروانی

آسماں کچھ اور بھی پہلے سے اونچا ہوگیا
میں نے بس سوچا ہی تھا تارا کوئی توڑا نہ تھا

سالک جمیل براڑ

کبھی جن کی چھاؤں میں بیٹھا نہیں تھا
کئی پیڑ ایسے لگائے تھے میں نے

انوار انجم

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پنجاب کی اُردو غزل کوثر و تسنیم کے ساحلوں سے نہیں گنگا جمنا کے کناروں سے بات کرتی ہے۔ پنجاب کی اُردو غزل نے دلّی اور لکھنو کی طرح محل سراؤں میں رہنے والی اپسراؤں کی ناز برداری نہیں کی۔ پنجاب کی غزل نے ہمیشہ گاؤں کے فطری حسن اور شہر کے بانک پن کی بات کی ہے۔ پنجاب کا ہر چھوٹا بڑا شاعر، ہر ذاتی اور مجموعی تجربے کے ساتھ ساتھ روزانہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو بھی ذہنی سطح پر محسوس کرتے ہوئے اپنے رگ و پے میں اُتار لیتا ہے اور پھر تخلیق کے کرب سے گزر کر اُسے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیتا ہے۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بھی پنجاب کا نوجوان اور مبتدی شاعر بھی عرش سے اپنی پرواز کا آغاز کرتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنے پیش رووں سے رہنمائی حاصل کرتا ہوا خود کو کبھی خلاؤں میں معلق نہیں ہونے دیتا۔

مالیرکوٹلہ کے علاوہ پنجاب کے دیگر شہروں میں بھی اُردو غزل کے نئے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ چاہے وہ اپنی عمر کے کسی بھی پڑاؤ میں ہوں لیکن وہ اپنی استعداد کے مطابق چمنستانِ غزل کو آباد و شاداب کرنے کی مساعی میں لگے ہوئے ہیں اور اکیسویں صدی میں پنجاب کی اُردو غزل کے منظر نامے پر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قوسِ قزح کا عکس پیش کر رہے ہیں۔ جن میں کئی رنگ ہلکے اور کئی رنگ بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

اگر غیروں کی قسمت میں لکھی تھی روشنی اُس کی
ستارا میری نظروں میں وہ کیوں پھر جھلملایا تھا

کسم خوشبو

ہم غلط فہمی نہیں رکھتے ہیں کوئی دل میں
ہم کو معلوم ہے اے نورؔ حقیقت اپنی

ایس نندہ نورؔ

دریا نے سوکھ کر مجھے حیران کردیا
اُس پار کا سفر میرا آسان کردیا

ڈاکٹر روی ضیاء

درمیاں ماں کے اور بیوی کے
پک گئے کان پُچھلیاں سُن سُن

نریش مہاجن زرگنؔ

وہ مجھ کو موتیوں میں تول دیتا
اگر میں اُس کے حق میں بول دیتا

ششی بھوشن چراغ

رشتوں کے پیڑ کتنے گھنے تھے نہ پوچھیئے
لیکن پڑی جو دھوپ تو سایہ نہ کرسکے

راجندر ٹوکی

وہ گلوں کے ساتھ کانٹوں کو نہ کرپایا قبول
اس کے گلشن کی بہاروں کو خزاں ہونا ہی تھا

پونم کوثرؔ

آستیں میں وہ پالتا ہے سانپ
ہاتھ میں جو گلاب دیتا ہے

چاند شرما

اُتر جائے نہ دریا سوچ کا دِل سے کہیں اپنے
چلو ہم گھر کے سارے کاغذوں کو کشتیاں کرلیں

پروندر شوخ

راہ میں رُک کر نہ یوں مُڑ کر دوبارا دیکھنا
مار ڈالے گا مجھے ایسے تمہارا دیکھنا

سُتنتر دیو عارف

''ہم نے دنیا کو تہذیب سکھائی تھی''
یہ سکّہ اب کتنی دیر اُچھالیں گے

روی کمار

پنجاب میں آزادی کے بعد بالخصوص گذشتہ دس پندرہ برسوں میں اُردو غزل کا جو نیا منظر نامہ اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہاں آج بھی چراغ سے چراغ جلانے کا عمل جاری ہے اور جب تک روشنی کا یہ سفر جاری ہے۔ اُردو غزل کا چراغ روشن رہے گا تعجب نہیں کہ کل انھیں چراغوں سے کوئی ایسا چراغ بھی روشن ہو جو آسمان غزل پر آفتاب بن کر چمکے۔ یہ اُردو کی تہذیب اور اُردو غزل ہی کا جادو' ہے جو آج بھی لوگوں کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ پنجاب کا شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا، جہاں اُردو سیکھنے سکھانے اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری نہ ہو۔ چاہے یہ کام ذاتی سطح پر ہو رہا ہو یا سرکاری سطح پر۔ ہر شہر میں دو چار اُردو کے ایسے دیوانے ضرور موجود ہیں جو اُردو زبان اور اُردو غزل کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اِن حقائق کی بنیاد پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پنجاب میں اُردو زبان ہمیشہ زندہ رہے گی اور اُردو غزل کا مستقبل زیادہ تابناک نہ سہی روشن ضرور ہوگا۔

☆☆☆